فکر اسلامی کی اصلاح

امکانات اور دشواریاں

ڈاکٹر طہٰ جابر علوانی

فکر اسلامی

کی اصلاح

امکانات اور دشواریاں

ڈاکٹر طٰہٰ جابر علوانی

قاضی پبلشرز و ڈسٹری بیوٹرز
ویج بلڈنگ حضرت نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

www.KitaboSunnat.com

نام کتاب ــــــــــ فکر اسلامی کی اصلاح۔ امکانات اور دشواریاں
مصنف ــــــــــ ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی
مترجم ــــــــــ شفیق الرحمٰن ندوی
سن طباعت ــــــــــ ۱۹۹۴ء
طبع اول ــــــــــ
تعداد ــــــــــ
مطبع ــــــــــ
کتابت ــــــــــ محمد الیاس مظفر پوری

2270

ناشر
قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
ویٹیج بلڈنگ، حضرت نظام الدین ویسٹ نئی دھلی ۱۳

فون
۲۶۱۷۲۴۰

2770

فہرست

تمہید

الحمد للہ رب العالمین، نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونستہدیہ

ونصلی ونسلّم علیٰ خاتم أنبیائہ ورسلہ محمد بن عبداللہ وصفوتہ

من خلقہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وأصحابہ وسلم تسلیماً کثیراً۔

جس وقت یہ کتابچہ تیار کیا گیا تھا اس وقت اس کی طباعت اور عمومی نشرواشاعت پیشِ نظر نہ تھی، اس وقت ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ ادارہ کے مشیران اور اسکے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے والے حضرات اس سے استفادہ کریں گے اور یہ کتابچہ ان کے لئے گائیڈ لائن کا کام دے گا۔

یہ کتاب مشترکہ غور وفکر کی تعبیر کی ایک کوشش ہے، اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتی ہیں کہ مشترکہ غور وفکر کے لئے کوئی ایسی فکری بنیاد ہونی چاہئیے جسے المعہد العالمی للفکر الاسلامی سے وابستہ جملہ افراد اپنا رہنما اصول بنا سکیں خواہ وہ ادارہ کے ذمہ دار ہوں یا اس کے معاونین۔

اس کتابچہ کے اولین مخاطب ادارہ کے تحقیقی مشیران اور معاونین تھے جو ادارہ کے ۲۶ر رجب تا ۲ر شعبان ۱۴۰۹ھ مطابق ۴ر تا ۱۰ر مارچ ۱۹۸۹ء کے سیمینار میں شریک تھے۔ اس سیمنار کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ ابتدا سے اب تک ادارہ کے کاموں کا جائزہ لیا جائے۔ فکری اور ثقافتی کاوشوں کے واسطے آئندہ کے لئے طریقۂ کار متعین کیا جائے گذشتہ کاوشوں میں جہاں کہیں جھول ہو اُسے دور کیا جائے، کہیں اصلاح وترمیم کی ضرورت محسوس ہو تو مناسب اصلاح وترمیم کرکے فکر وثقافت کے کارواں کو صحیح سمت میں رواں دواں رکھا جائے۔

یہ لائحہ عمل سیمنار کے جملہ شرکاء کی توجہ کا مرکز بنا، لوگوں نے کھلے دل سے اس کے

مندرجات کے ضمن میں بحث ومباحثہ میں حصہ لیا بعض لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ نا مساعد حالات کی بنا پر جو حضرات سیمینار میں شریک نہیں ہو سکے ہیں اور زیر بحث مسائل میں تبادلۂ خیال نہیں کر سکے ہیں انھیں بھی شریک کیا جائے، اس مقصد کے تحت یہ کتابچہ اہلِ دانش اور علماء کرام کی معتدبہ تعداد کے پاس روانہ کیا گیا بالخصوص ان حضرات کے پاس جو ادارہ کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے ہیں۔

جن احباب کے مطالعہ میں یہ کتابچہ آیا ہے اور جن حضرات نے بہ نفسِ نفیس سیمینار میں شرکت کرکے اس کے مباحثوں میں حصہ لیا ہے ان سبھوں کی رائے ہوئی کہ اسے طبع کرکے اس کی افادیت کا حلقہ وسیع کیا جائے۔ بعض افراد نے اسے "علم و آگہی کو اسلامیانے کے اصول ومبادی اور لائحہ عمل" کی ایک نئی پیشکش اور ایک ترقی یافتہ کوشش قرار دی۔ جس کے اندر گذشتہ برسوں کے تجربات اور میدانِ عمل کی دشواریوں کی جھلکیاں موجود ہیں اس کے بعد ہم نے مزید یہ کیا کہ مقالہ پر مباحثہ کے دوران جو نقاط اٹھائے گئے تھے اور تحریری طور پر جو تجاویز آئی تھیں ان سب کو یکجا کر دیا، پھر پورے مسودے کو ادارہ کے مشیر حضرات کے حوالہ کر دیا گیا پھر آخری طور پر برادرم جناب پروفیسر عمر عبید حسنہ نے اس پر نظر ثانی فرمائی اور حذف واضافہ اور ترمیم واصلاح کے بعد مسودے کو آخری شکل دی ہے جو اس وقت قارئین کے سامنے ہے۔ موجودہ شکل میں یہ کتاب اگرچہ عمومی خطاب کی بعض اہم خصوصیات پر مشتمل ہے پھر بھی اصل مقالے میں پیش کردہ فکری وثقافتی خصوصیات کے دائرے سے پورے طور پر خارج نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں اس کتاب کے اندر جو افکار وخیالات پیش کئے گئے ہیں وہ ان تمام لوگوں کو اپیل کریں گے جنھیں فکری وثقافتی بحران کے سلسلے میں ہموم واحزان اور غور وفکر کا ذرا بھی حصہ ملا ہے۔ البتہ اس کے مطالعہ کے دوران کسی قدر قوت برداشت اور غیر جانبداری درکار ہوگی اسی کے ساتھ اسلامی تمدن کی تعمیر نو میں فکر وثقافت کی اہمیت کا احساس بھی ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔

آج امت مسلمہ جن دشوار گذار حالات سے دوچار ہے اور جس پر آشوب دور سے وہ گذر رہی ہے اس میں کم ہی لوگ فکری مسائل کی جانب توجہ کرنے کی زحمت برداشت

کرنے کے لئے آمادہ ہوں گے کیونکہ ہم جس علاج کی دعوت دے رہے ہیں اور اُمت کے سامنے جو دوا پیش کر رہے ہیں وہ طویل المیعاد علاج ہے اور فکر اس کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے، لیکن پیہم ناکامی، ذلت وخواری اور زیاں کے احساس سے جو حقیقت سامنے آرہی ہے وہ یہ سوال ہے کہ اگر اُمت کے عقائد درست ہوتے، اس کے سوچنے اور غور وفکر کا نہج صحیح ہوتا، وہ اپنے ارادے میں خود مختار ہوتی، اسے کامل آزادی نصیب ہوتی، اور اس کے افراد کی صحیح تعمیر وتربیت کی جاتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ ایسے دلدوز و دلفگار واقعات پیش آتے جو رونما ہوئے، اور کیا اُمت مسلمہ کی شیرازہ کو تار تار کرنا، اس کی یکجا قوتوں کو پاش پاش کرنا اور اس کو پیچھے کی جانب ڈھکیل دینا شیاطین کے لئے ممکن ہوتا؟ اگر فکری بحران کا دور دورہ نہ ہوا ہوتا، اور اگر ثقافتی شناخت اور دعوتِ اسلامی ایک طویل عرصے سے میدانِ عمل سے غائب نہ ہو چکی ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اعداء اسلام کے جال میں اس حد تک پھنس جاتی اور اس کی حالت ایسی قابلِ رحم ہو جاتی؟ شاید ہی کوئی صاحبِ نظر اس حقیقت سے انکار کی جرأت کر سکے کہ اس امت کو زندہ رہنے کے لئے غذا اور ہوا کی جتنی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ ضرورت اسے فکری اصلاح اور اسلامی تمدن کے ظہور میں آنے اور تہذیبی وجود کا ثبوت فراہم کرنے کی ہے۔ ہمارا یہ کتابچہ دراصل اسی ضرورت واہمیت کو یاد دلانے کی ان شاء اللہ خدمت انجام دے گا۔

اللہ ہر شخص کو اپنی مرضی اور پسندیدہ کام کی توفیق ارزانی فرمائے۔ اور امت کو اپنی آزمائش کے دور سے گذرنے، اپنے زخموں کا علاج کرنے اور شفایابی تک رسائی حاصل کرنے میں بھرپور مدد فرمائے۔ انہ سمیع مجیب۔

طٰہٰ جابر علوانی صدر المعہد العالمی للفکر الاسلامی	ربیع الاول ۱۴۱۲ھ ستمبر ۱۹۹۱ء

مقدمہ

ہر قسم کی تعریف اس رب کریم کے لئے ہے جس نے انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا، اور اسے شرعی احکام کا مکلف بنا کر اس کے کاندھے پر خلافتِ ارضی کا بار ڈالا تاکہ تمدن پروان چڑھے۔ اور پوری انسانی برادری وحی الٰہی کی ہدایت اور عقلِ انسانی کی رہنمائی میں خالق کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرے، جس رب کریم نے انسان کو فکری و دینی طور پر مطمئن کرنے کی غرض سے بات چیت، بحث و مباحثہ اور اچھے ڈھنگ سے مناظرہ کو بہترین وسیلہ قرار دیا، کیونکہ اس طرح اطمینان دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتا ہے، اطمینانِ قلب ہی سے اس ایمان کی کرنیں پھوٹتی ہیں جسے انسانی عمل و کردار کے لئے بہترین مربی تسلیم کیا گیا۔

درود و سلام ہو اس ذاتِ اقدس پر جس کا شیوہ لوگوں کو خیر کی تعلیم دینا تھا۔ جس نے فکری بالادستی کی تعمیر اور قرآن کے ذریعہ مجاہدہ کو ارفع جہاد قرار دیا، نیز فکری میدان کو تمدنی گفتگو کا میدان اور اسلام و مخالفین اسلام کے مابین حقیقی معرکہ ٹھہرایا، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

فلا تطع الکافرین وجاهدهم به جهادًا کبیرًا۔ (سورۃ فرقان:۵۲)

"پس اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔"

کفار کے ساتھ سارا جہاد اس مقصد کے تحت تھا کہ عقلِ انسانی تک کلمۂ حق اور صحیح علم و آگہی کی رسائی کی راہ میں ان کو حائل ہونے اور رخنہ ڈالنے سے روکا جائے۔ اس لئے کہ کلمۂ حق اور صحیح علم و آگہی کی عقلِ انسانی تک رسائی ہی انسان کی اصلاح اور اس کی تہذیبی و تمدنی

تشکیل کا ذریعہ اور وسیلہ ہے ارشاد باری ہے:

وقال الذین کفروا لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فیه لعلکم تغلبون

(سورہ فصلت: ۲۶)

"یہ منکرین حق کہتے ہیں: اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو شاید کہ اسی طرح تم غالب ہو جاؤ۔"

ان دنوں مسلمانوں کے شب و روز بحرانی دور سے گذر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے راہِ صواب اور صحیح طریقۂ کار کھو دیا ہے۔ ان کا تمدنی وجود میدانِ عمل سے رخصت ہو چکا ہے۔ اپنے حالات پر نظر ثانی اور اپنے معاملات کی اصلاح سے عاجز و درماندہ ہو گئے ہیں نہ پستی اور زوال کے اسباب کا پتہ لگانے کی فکر ہے اور نہ خلل و کمزوری کی تشخیص کی ہمت۔ انسانی برادری کے تئیں ان پر نگرانی و قیادت کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی ادائیگی سے یکسر بے بس و ناتواں ہو چکے ہیں جس کا فطری نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ آج مسلمانوں کی پوزیشن تاریخی سیاق سے خارج ہو چکی ہے نہ ان کا حال قابل دید ہے اور نہ ان کا مستقبل امید افزا ہے۔

دنیا کے اسٹیج سے اسلامی تمدن کی غیر حاضری یا تمدنی بحران جس سے آج اُمت مسلمہ دوچار ہے وہ اقدار میں تہی دستی کے سبب نہیں ہے کیونکہ اسے وافر مقدار میں اللہ تعالیٰ نے عطا بھی فرمایا ہے اور کتاب و سنت میں اس کی حفاظت کی پوری ذمہ داری بھی لی ہے اسلام کے آخری اور دائمی پیغام ہونے کے بھی معنی یہی ہیں بالفاظ دیگر دشواری یا بحران جس میں ذہن مسلم گرفتار ہے وہ اقدار کا بحران نہیں ہے۔ بلکہ اقدار کے ساتھ رویہ کی تعیین اور فکری کاوشوں سے عاجزی کا بحران ہے۔ جبکہ یہی فکری کاوشیں ان اقدار کو زمانے کے ساتھ مربوط کرتی ہیں۔ قرآنی نقطۂ نظر کو ساتھ لے کر اشتراکِ عمل کرتی ہیں۔ اسلام کے پیغام میں ابدیت کے نقوش کی نشاندہی کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ اسلام بانجھ نہیں ہو گیا ہے بلکہ زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز ہو کر انسانیت کے درد کا درماں بننے کی اس میں پوری صلاحیت

موجود ہے۔ ابھی اس کا کشکول خالی نہیں ہوا ہے ابھی وہ عطائے جدید پر پوری طرح قادر ہے یہ خدمت فکر یا عالم افکار کے ذریعہ انجام پاتی ہے اور یہی وہ میدان ہے جس میں ہم بحران کا شکار ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ دو چیزیں ہیں جو ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ایک ہے فکری بحران جس سے مسلمان دوچار ہے جس کے نتیجے میں وہ اقدار کے ساتھ درست رویہ نہیں کر پا رہا ہے اور جس کے سبب ان اقدار کو موجودہ زمانے پر منطبق کرنے سے قاصر ہے۔ دوسری چیز یہ وہم ہے کہ خود اقدار ہی کا بحران ہے۔ ان دونوں چیزوں کے درمیان خلط ملط ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ مغالطوں میں پڑ گئے، پیچھے قدم ہٹا لیا اور ان کے ذہن ودماغ میں نفسیاتی گرہیں پڑ گئیں، پھر دینداری کے نام پر پسماندگی کو تقویت پہنچائی جانے لگی۔ اس لئے ہمارا پختہ یقین ہے کہ اسلامی علم وآگہی کے لئے آج جو چیزیں ناگزیر ہیں ان میں اولین چیز یہ ہے کہ زندگی کے قافلے کو متحرک اور رواں دواں رکھنے کے واسطے جو فکری پیمانے مطلوب ہیں ان کے اور ناقابلِ تغیر اقدار کے مابین پیدا ہو جانے والے خلط واشتباہ کو سب سے پہلے دور کیا جائے۔

زندگی کے پلیٹ فارم سے اسلامی تمدن کا غائب ہو جانا فکر کا اولین اور سب سے پہلا بحران ہے۔ اس لئے کہ اسلامی تہذیب وتمدن اور علوم کو اسلامیانے کے واسطے جو فکری نظام مطلوب ہے اس کا کارواں گذشتہ انسانی عقلوں کی سرحد تک پہنچ کر تھم گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری عقلوں کو مفلوج اور ان کو فطری کارکردگی سے معطل رکھنے ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور سابقہ عقلوں کے نتائج فکر کو ہم نے آخری اور حتمی چیز قرار دے دیا ہے اسلام کا پیغام ابدی اور دائمی ہے لیکن ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ اپنا زمانی ومکانی فاصلہ طے کر کے آخری منزل تک پہنچ گیا ہے۔ اب اسے آگے نہیں بڑھنا ہے۔ ذہن وفکر کو معطل رکھنے کا ثمرہ یہ برآمد ہوا کہ اسلام کا تمدنی وجود ہی دنیا کے اسٹیج سے غائب ہو گیا۔ اس صورتحال نے ہم پر لازم کر دیا کہ بحیثیت ایک امت ہم اپنا محاسبہ کریں، بحران کے اسباب اور اس کے

نتائج کا پتہ چلائیں اور دیکھیں کہ بگاڑ کہاں ہے؟ دکھتی رگ کونسی ہے؟ پھر ہم اقدار کی رہنمائی میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق فکری قالب تیار کریں جو اسلام کے تمدنی وجود کو واپس لانے اور اُمت کو صحیح فکری پیمانہ عطا کرنے پر قادر ہو، ساتھ ہی ساتھ اس امت کی تعمیر و تشکیلِ نو کا فریضہ انجام دے سکے جسے دیگر امتوں پر گواہ بنایا گیا ہے۔

لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا۔

(سورة البقره : ۱۴۲)

"تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو"

متوقع تہذیبی تبدیلی کو روبہ عمل لانے میں ایک طویل عمر درکار ہوگی، ساتھ ہی مختلف اور متنوع علاج کی ضرورت پیش آئے گی۔ کیونکہ یہ انسان کی تعمیر جدید اور تشکیل نو کا کام ہے جو کوئی معمولی کام نہیں ہے بلکہ انسان کی فطرت اور اس کی شخصیت کے ساتھ جو پیچیدہ عوامل وابستہ و کارفرما ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی تشکیل نو سب سے زیادہ کٹھن، پیچیدہ اور جاں گسل کام ہے۔ یہ کام اس لئے بھی دشوار ہے کہ انسان بہ یک وقت وسیلۂ علاج بھی ہے اور محل علاج بھی۔

مبالغہ نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ یہ ایک مختلف الجہات عمل ہے کیونکہ اس کام میں تعلیم و تربیت اثر انداز ہوگی تو ذرائع ابلاغ بھی موثر کردار ادا کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ جملہ فکری و تہذیبی سرچشمے یکجا طور سے اس میں دخیل ہوں گے۔ چنانچہ مناہج فکر کی اصلاح از سر نو تہذیبی تشکیل اور علم و آگہی کے کارواں کو صحیح سمت میں چلانا تاکہ اس کے اسلامی مقاصد بروئے کار آئیں اور اصل سرچشموں سے اس کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے، ان سب کاموں کیلئے ضروری ہے کہ ایسا نقطۂ نظر اپنایا جائے جو ہمہ گیر اور معتدل ہو، غیر متوازن نہ ہو کیونکہ دیگر اثر انداز ہونے والے پہلوؤں سے الگ تھلگ رہ کر اور ان کو نظر انداز کر کے کسی ایک پہلو کی اصلاح کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ہے اس لئے ہم نے اس کو پسند کیا ہے کہ ایک طرف فکری پوزیشن یا تہذیبی سرحد کی مسلسل نگہداشت ہو تو دوسری جانب عقلی مناہج کی اصلاح، فکری بالادستی کو وجود میں لانے نیز کتاب و سنت کی روشنی میں تہذیبی سرچشموں

کی صفائی و تطہیر جیسے اہم اور مشکل کام کی جانب توجہ کی جائے کیونکہ ہمیں پختہ یقین ہے کہ اسی کے ذریعہ وہ تمدنی سانچے تیار ہوں گے جن کے اندر انسانی تمدن کی تعمیر نو ہوگی اور اسلامی زندگی کا از سر نو آغاز ہوگا۔

تہذیبی سرحد کی حفاظت و نگہداشت کا انتخاب، اصلاحی تحریکوں میں سے کسی تحریک، بیداری اور تمدنی ترقی میں سے کسی ایک کا بدل نہیں ہو سکتا ہے پھر بھی ہم نے اس کا انتخاب کیا ہے کیونکہ جملہ قافلوں کے صحیح سمت میں رواں دواں ہونے کے واسطے وہ ایک ناگزیر اور دائمی شرط ہے چونکہ مسئلہ بڑا نازک اور صبر آزما ہے اور اس کے متبادل کی تلاش پیچیدہ اور دشوار ہے اس لئے راہ کی تصحیح، مقصد کی تعیین، کامیابی کے وثوق، پوری ہوشیاری کے ساتھ اقدام سے پہلے اس کا جائزہ لینے اور مختلف امور میں کون سے کام قابل ترجیح ہیں ان سب امور میں جانفشانی کرنا ازبس ضروری ہے اس کے فکر و خیال کی اچھی طرح وضاحت کی جائے. عوام کے سامنے اچھے ڈھنگ اور دل کش اسلوب میں پیش کیا جائے، کمزور پہلوؤں کی اصلاح کی جائے اس کی تبلیغ کے ضمن میں جو عناصر کار آمد اور مطلوب ہوں ان کو حاصل کیا جائے. اسی کے ساتھ حال کا صحیح جائزہ لیا جائے جس میں ہمارے شب و روز بسر ہو رہے ہیں اور مخاطب کے احوال و کوائف کا بھی بدقت نظر مطالعہ کیا جائے.

یہاں یہ حقیقت ذہنوں سے اوجھل نہ ہونے پائے کہ ان چیزوں میں ہم کامیابی اور کمال کے جس مقام پر بھی پہنچ جائیں کسی بھی مرحلے میں ہم غیر ضروری خود اعتمادی کے جال میں گرفتار نہ ہوں بلکہ ہمارا بھروسہ اللہ کی ذات پر ہو، نبوت سے رہنمائی حاصل کریں ماضی کے واقعات سے درس و عبرت لیں اور گذشتہ لغزشوں سے اجتناب کریں، اور سابق میں جو علمی و فکری سرمایہ جمع ہو چکا ہے اس سے صحیح استفادہ کریں، اسی کے ساتھ پیہم صبر و برداشت سے کام لینا پڑے گا، کیونکہ مناہج فکر کی اصلاح اور علم و آگہی کو اسلامیانے کے مسئلہ کے چہار جانب پسماندگی کی دبیز دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں اور اسلامی تمدن کی عدم موجودگی کے تباہ کن نتائج برآمد ہو رہے ہیں چنانچہ برملا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ علوم و معارف کے بہت سے پہلو اپنے اسلامی سرچشموں سے دور ہو چکے ہیں اپنے مقاصد سے کنارہ کش

ہو چکے ہیں اور اسلامی سیاق سے خارج ہو چکے ہیں۔

راہ کی کٹھنائیوں اور کام کی نزاکتوں کا احساس ہمارے اندر اس وقت مزید بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اعجاز، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت اور قدرت بیان کے باوجود صحابۂ کرام کی ایک کثیر تعداد اسلام لانے سے قبل ایک یا دو دہائیوں تک اپنے سابقہ حالات و افکار و خیالات پر قائم رہی۔

یہاں ایک اور مسئلہ ہے جو کچھ کم قابلِ توجہ نہیں ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے منہج اور طریقۂ کار کے لئے نشانِ راہ متعین کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے، اس میں کامیابی کے لئے بہت زیادہ بحث و مباحثہ، غور و فکر، اور باہم بات چیت کی ضرورت پڑے گی تاکہ پیش کردہ نظریہ امتحان و آزمائش کی کسوٹی سے گذرنے کے بعد بالکل نکھر کر سامنے آئے اور اپنی جڑیں مضبوط کرے، اس مسئلہ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی فائل ہمیشہ کھلی رہنی چاہیئے تاکہ جدید سے جدیدتر کا اندراج اس میں ہوتا رہے اس طرح معیار افراط و تفریط سے محفوظ رہیں گے اور نتائج میں پختگی آئے گی پھر نتائج کے بارے میں مکمل اطمینان ہوگا۔ منہج اور طریقۂ کار کے مسئلہ پر بار بار غور و خوض اور نظرِ ثانی کوئی عیب کی چیز نہیں بشرطیکہ غور و فکر کے وسائل میں تنوع ہو، تاکہ زیر بحث قضیہ کے دوررس اثرات سے واقفیت ہر ایک کے لئے ممکن و آسان ہو۔

ایک دشواری یہ بھی پیش آسکتی ہے کہ اصلاح، بیداری اور تمدنی ترقی سے متعلق بیشتر تحریکیں بڑی حد تک فکری امراض کے نتائج و آثار کے علاج اور شکل و صورت کے اندر بار بار ترمیم کے کاموں میں مشغول ہو کر رہ گئیں، گویا ان تحریکوں نے ذیلی چیزوں اور ان کی اصلاح کے بارے میں غور و خوض میں زیادہ وقت صرف کیا اور افکار کی اصلاح سے چشم پوشی جن کے یہ نتائج ہیں چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ منہج اور طریقۂ کار میں نقص باقی رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کے نتائج میں بھی نقص برقرار رہتا ہے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ معیاروں کی تصحیح اور منہج و طریقۂ کار کی اصلاح کے قضیے کو زیر بحث لائے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے اس کے بعد ہی اُمت کی تعمیرِ نو کا کام انجام پا سکے گا جو قرآن کی زبان میں "اُمتِ وسط" کہلانے کے لائق ہو اور جو دوسروں پر گواہ ہو اس کی یہ گواہی رسول کی شہادت سے ماخوذ ہو۔

وکذٰلک جعلنٰکم اُمۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیداً (سورۃ البقرہ : ۱۴۲)

"اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمت وسط بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔"

پہلے بھی بہت سے لوگوں کو یہ وہم رہا ہے، آج بھی بہت سے لوگ اس وہم میں گرفتار ہیں کہ مادی چیزوں اور مادی مصنوعات کا افکار سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہوتا یہ خیال خام اور بچکانہ ذہن کی پیداوار اور افسوسناک ہے۔ کیونکہ چیزیں افکار ہی کی مادی شکلیں ہیں، چیزوں کے وجود میں آنے کے باعث و محرک افکار ہی ہوتے ہیں۔ چیزوں کے اندر افکار کا ماحول اور اس کی تہذیب رچی بسی ہوتی ہے کیونکہ چیزیں کہیں خلاء سے وجود میں نہیں آتی ہیں بلکہ وہ ایک فکری تسلسل کا نتیجہ و ثمرہ ہوتی ہیں اس لئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جملہ مصنوعات ان افکار و خیالات کی ترجمانی و عکاسی کرتی ہیں جو ان کے بنانے والوں کے ذہن و دماغ پر چھائے ہوتے ہیں۔ خواہ اس بنی ہوئی چیز کا ماخذ و مبدأ ہو، اس کے اغراض و مقاصد ہوں یا اس کا کام ہو ہر ایک میں صانع کی ثقافت رچی بسی نظر آتی ہے۔ اسی طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تمدنی فقدان کی جس مصیبت میں ہم گرفتار ہیں وہ ان افکار ہی کے نتیجے میں آئی ہے جو مادی اشیاء سے کہیں زیادہ پُرخطر ہیں۔ جہاں تک چیزوں کا تعلق ہے تو وہ محض فکر کے لئے رمز و علامت کا درجہ رکھتی ہیں۔

فکری انضباط اور تہذیبی شناخت ہی سے قوم و ملت کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں نشانِ راہ کی تعیین ہوتی ہے، اور اسی سے یہ اطمینان حاصل ہوتا ہے اس کا مبدأ اور نقطۂ آغاز درست ہے اس کے اغراض و مقاصد صحیح، اس کی ترجیحات اصلی، اور اس کے افکار و اعمال ہم آہنگ ہیں اس وقت ہمیں جس دشواری کا سامنا ہے وہ یہ ہے کہ اُمت اپنے افکار اور اعمال دونوں میں بڑی حد تک اسلامی سیاق سے خارج ہو چکی ہے۔ جبکہ مطلوب انسان کو اپنی عبدیت کا تسلسل کے ساتھ احساس دلانا ہے تاکہ اس کی نماز، اس کی قربانی، اس کی زندگی اور اس کی موت سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہو جائے، نیز

اقتصادی، معاشرتی، فکری اور اعتقادی ہر قسم اور ہر رنگ کے شرک سے وہ آزاد ہو جائے۔

آج مسلمانوں کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ اگر ان میں سے کچھ کو بعض عبادات کی ادائیگی کی توفیق مل جاتی ہے تو اسی کو وہ کافی سمجھتے ہیں۔ دوسرے معاملات میں خدائی احکام کی خلاف ورزی کا انہیں ذرا احساس نہیں ہوتا، وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ ان کی زندگی کا کارواں اسلام کے دائرہ میں رواں دواں ہے یا اسلام کے دائرے سے باہر نکل چکا ہے ایسا اس لئے ہے کہ علم حکمت سے جدا، علم و آگہی اخلاق سے دور اور دین زندگی سے الگ ہو چکا ہے۔

مناہجِ فکر کی اصلاح اور علم و آگہی کو اسلامیانے کے ضمن میں بنیادی و اساسی مفہوموں پر روشنی ڈالنے کی المعہد العالمی للفکر الاسلامی نے جو کوشش کی ہے اس کی بنا پر وہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ اس کے کام میں کوئی جدّت ہے اور اس نے کوئی نئی چیز امت کے سامنے پیش کی ہے۔ نہ ہی وہ یہ دعویٰ کرنے کے قابل ہے کہ اس نے کوئی ایسی چیز پیش کی ہے جو فکر کے مسئلہ کو حل کر دے اور اُمت کو تہذیبی بحران کے دلدل سے نکال سکے البتہ ادارہ کے اطمینان کیلئے یہ بات کافی ہے کہ اس کی جملہ کد و کاوش کا حاصل خلاء کو پُر کرنے کی کوشش ہے جس کی جانب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

"دوسرے انبیاء کے مقابلے میں میری حیثیت یہ ہے کہ کسی شخص نے ہر لحاظ سے مکمل ایک حسین و جمیل عمارت بنوائی، البتہ اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی، لوگ گھوم پھر کر عمارت دیکھتے، پسندیدگی کا اظہار کرتے، ساتھ ہی یہ بھی کہتے کاش یہ آخری اینٹ بھی رکھ دی گئی ہوتی، میں انبیاء میں وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم الانبیاء ہوں[1]۔"

اصلاح کے میدان میں ہونے والی گذشتہ کاوشوں کا نہ ہم انکار کرتے ہیں اور نہ ان کی اہمیت گھٹاتے ہیں بلکہ ہم انہیں عمارت میں استعمال ہونے والی اینٹیں قرار دیتے ہیں جن میں سے ہر اینٹ کی اپنی اہمیت ہوتی ہے اسی طرح ہم گذشتہ کاوشوں کے تجربات کا

---

[1] سنن ترمذی کتاب المناقب۔

لحاظ کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

یہ کتابچہ جسے ہم قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں اس کے بارے میں ہم کسی خوش فہمی میں گرفتار نہیں ہیں اور نہ ہی ہم اسے کوئی جادو اثر نسخہ سمجھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے، نقص و بگاڑ دور ہو جائے گا اور مسلمانوں کے فکری بحران کا خاتمہ ہو جائے گا ہمارے نزدیک اس کتابچہ کا کام صرف یہ ہے کہ مسئلہ کے تئیں لوگوں میں فکر مندی پیدا کر دے، موضوع کو زیر بحث لائے اور لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دے، مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالے، تمدنی ترغیبات و تنبیہات کو پیش کرے، اُمت کے بحران کے ضمن میں جو بنیادی اور محوری قضیہ ہے اس کی جانب فکری کاوش کا رُخ موڑ دے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کاوش کو نہ کسی کتاب کا نام دینا پسند کیا ہے اور نہ کسی کتاب کا منصوبہ قرار دیا ہے بلکہ اس کی حیثیت لائحہ عمل اور گائیڈ لائن کی ہے جو بحث و مباحثہ اور مناقشہ کے لئے پیش ہے۔ اور ایک کھلی فائل ہے جس میں اس موضوع سے متعلق جملہ سنجیدہ کاوشیں آسکتی ہیں۔ موضوع کی اہمیت و نزاکت کے ضمن میں یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ اس سے چشم پوشی کے نتیجے میں ملت کو ہر سال ایک یا دو بار بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سے دعا ہے کہ ہمارے ارادے میں اخلاص عطا فرمائے، صحیح عمل کی توفیق ارزانی فرمائے اور رشد و ہدایت کی دولت سے مالا مال کرے بلاشبہ وہ بہترین کارساز ہے۔

عمر عبید حسنہ

دوحہ قطر

رجب ۱۴۱۱ھ، جنوری ۱۹۹۱ء

علم و آگہی کے اسلامیانے کا قضیہ

اُمت کے سامنے پیش کرنے کے اسباب و محرکات

کسی بھی انسانی کام اور سرگرمی کو موثر اور بارآور بنانے کے شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ انسان جس کام کا بیڑا اٹھا رہا ہے اس کی بنیاد و اساس سے آگاہ ہو، اس کے اغراض و مقاصد سے آشنا ہو، اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ یہ عمل نفاذ کی صلاحیت کتنی رکھتا ہے، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے ذمہ داری کے سلسلے میں جوابدہ ہونے کا پورا احساس ہو، اسلام کے تمدنی وجود جس کو وہ واپس لانا چاہتا ہے لیکن اس کا نمونہ روئے زمین سے غائب ہو چکا ہے اس کے اور مسلمانوں کے موجودہ حالات کے مابین کتنا تضاد ہے اور اس ضمن میں اسے کتنے بڑے چیلنج کا سامنا ہے؟ اس کا اسے پورا شعور ہو، پھر یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کو زندگی اور اس کی تعمیر کے تئیں اپنے عمل و کردار کے سلسلے میں پورے طور پر باشعور ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی اس عمل کی تفصیلات اس کے اغراض و مقاصد اس کے وسائل و ذرائع، اور طریقۂ کار سے نہ صرف واقف ہو بلکہ اسے یہ بھی پتہ ہو کہ اس کام کی راہ میں کون سی دشواریاں حائل ہیں۔ کون سے امور ہیں جو اس کام کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں وہ یہ بھی جانتا ہو کہ جو چیزیں ترجیحات کا درجہ رکھتی ہیں ان کی فہرست میں اس کام کا درجہ اور ترتیب کیا ہے؟ اسی کے ساتھ وہ انسانی مزاج اور معاشرے کی تاریخی، سماجی اور نفسیاتی موازنے کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، مذکورہ بالا امور کے نتیجے میں عمل کی تاثیر بڑھتی ہے اور قوتِ عمل میں اضافہ ہوتا ہے۔

جب یہ چیزیں ہر ایسے کام کے واسطے مطلوب ہیں جس کی کامیابی مقصود ہے تو اس کی ضرورت و اہمیت میں اس وقت مزید اضافہ ہو جائے گا جب کام زیادہ اہم اور

نازک ہو ایسا کام جو کسی اُمت کے حالات کسی تمدن کی تعمیر اور نسلوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے سے متعلق ہو، بلکہ اس سے پوری دنیا کا انجام و مستقبل وابستہ ہو، جس کا مثبت و منفی اثر صرف حال تک محدود رہنے والا نہ ہو بلکہ اُمت کی زندگی کا وسیع مستقبل اس کے ساتھ اس طرح مربوط ہو جس طرح حال مستقبل کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔" مناہجِ فکر کی اصلاح اور علم و آگہی کو اسلامیانے" کا قضیہ جس کا بار اٹھانے پر المعہد العالمی للفکر الاسلامی تیار ہوا ہے اور جس کی دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری اس نے قبول کی ہے۔ ان مسائل میں سے ہے جو آج پوری قوت کے ساتھ از خود سامنے آرہے ہیں۔ معہد کی نگاہ میں یہ وہ قضیہ ہے جو اسلام کے موجودہ تمدنی منصوبے کی اہم بنیاد اور اساس بن سکتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے مکمل بھی ہے اور مغرب کی تمدنی منصوبے کا بدل بننے کی پوری صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ مغرب کے تمدنی اسکیم کی وجہ سے ہماری ملت کو سخت پریشانیوں اور سخت مشکلات کا سامنا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مغربی تمدن نہ ہمارے عقیدے سے میل کھاتا ہے نہ ہی وہ ملت کے سماجی و نفسیاتی تقاضوں سے آشنا ہے۔ بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اُمتِ مسلمہ کے تاریخی و تمدنی تشخص کو یکسر نظر انداز کرتا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ مجوزہ منصوبہ اس پہلو کی تکمیل کرے گا جسے تمام منصوبوں میں نظر انداز کیا گیا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے علم و تجربے میں آنے والے دیگر منصوبوں کے اندر وسعت نظری نہیں ہے اسی طرح ان منصوبوں میں انسانوں کے موجودہ حالات پر اسلام کو منطبق کرنے اور اسلام کے ذریعہ انسانوں کے عمل و کردار کی اصلاح و درستگی کے سلسلے میں معروضی نقطۂ نظر کی بڑی کمی ہے۔ بلکہ وہ منصوبے ایسے جزئی نقطۂ نظر کے حامل ہیں جس میں توازن و اعتدال کا فقدان ہے۔

مجوزہ اسکیم کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں ہر اصلاح اور ہر نشأۃِ ثانیہ کا آغاز منہجِ فکر کی اصلاح اور اسلام کے تہذیبی نظام کی استواری سے ہونا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر عالم افکار کی اصلاح اور اس کی تطہیر سے کام شروع ہونا چاہیئے تاکہ دوسروں کی تقلید اور حاشیہ برادری کی بجائے خالص اسلامی بنیادوں پر افکار و خیالات کی تشکیل ہو اور تمدنی زاویۂ نگاہ کو صحیح سمت عطا کیا جائے۔ اُمت اسلامی تمدن کے وجود میں لانے اور ایسے ذہن کی تشکیل پر قادر

ہو جو اسلامی سرچشموں سے رہنمائی حاصل کرے اور جدید تجربات سے فائدہ اٹھائے پھر دونوں کی ہم آہنگی سے ایسا اسلامی منصوبہ سامنے لاسکے جو مکمل ہو، اپٹوڈیٹ ہو، فکر اور فکری اوہام کے بحران سے آزاد ہو، منہج اور اس کی بے اعتدالیوں کی لغزش سے پاک ہو، ساتھ ہی تہذیبی فقدان اور اس کے نقصانات اور تمدنی پسماندگی کے دباؤ کا پورے طور پہ ادراک کرنے والا ہو۔

ایک حقیقت جو ہم اپنی آنکھوں کے سامنے آشکارا دیکھ رہے ہیں یہ ہے کہ فکر اسلامی کے مناہج کی اصلاح اور علم و آگہی کو اسلامیانے کا قضیہ مطلوبہ معیار پہ ویسا لوگوں کی توجہ اور فکرمندی کا مرکز نہیں بن سکا، اور نہ وہ مقام حاصل کرسکا جہاں سے وہ مسلمانوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتا حالانکہ اس کی اہمیت و نزاکت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ یہی نہیں بلکہ پوری توجہ کے ساتھ کمی کے اسباب اور کوتاہی کے پہلوؤں کا بھی جائزہ نہیں لیا گیا اور نہ ہی علمی اصول کی روشنی میں نقص و خلل کی جگہوں کی تعیین کی گئی اور نہ ہی اس کی روشنی میں اقدام عمل کو درست کرنے کی فکر و جستجو کی گئی، اس سے انکار نہیں کہ کاوشوں کے تسلسل سے میدان کبھی خالی نہیں لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے یہ کاوشیں انفرادی رہی ہیں۔ اجتماعی اور منظم طور پر نہیں رہی ہیں جس کی وجہ سے مطلوبہ نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان انفرادی کوششوں کے نتیجے میں تہذیبی تسلسل قائم رہا ہے۔ ابھی چند سال پیشتر تک یہ حال تھا کہ جہاں کہیں فکر اسلامی اور اس کے مناہج کی اصلاح کی بات چھڑی کہ شدید ردعمل سامنے آتا تھا۔ کبھی کبھی تو تحقیر و اہانت تک بات جا پہنچتی تھی۔

پیہم بحرانوں، مسلسل ناکامیوں اور مصائب کے تسلسل کے نتیجے کے طور پر آج مسلمانوں کے ذہن ایسے سوالات اٹھانے یا انھیں سننے پر آمادہ نظر آتا ہے جن کا سرا بعض اوقات اعتراض، مخالفت اور موجودہ حالات کا بالکلیہ انکار تک جا پہنچتا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو کہ ماضی قریب تک فکر کی اصلاح اور تبدیلی کے عمل میں اس کے رول کے بارے میں گفتگو سخت ناپسند کی جاتی رہی ہے تو علم و آگہی کے اسلامیانے کے سلسلے میں بات چیت کو اس سے کہیں زیادہ ناگواری اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ جوں ہی کوئی شخص کسی تقریر یا مقالے میں اس نوع کا خیال پیش کرتا اعتراض اور نکتہ چینی

کے لئے دسیوں آدمیوں کی آوازیں بلند ہوتیں اور سوالات کی بوچھار شروع ہو جاتی کہ علم و آگہی اور اسلامیانے میں آخر کیا جوڑ ہے ؟ علم و آگہی کا سرچشمہ جو بھی ہو وہ بذاتِ خود ایک یونٹ ہے۔ ملت و مذہب سے قطع نظر وہ پوری انسانیت کی ملک ہے کیا تم ہر چیز میں اسلام کو گھسیٹنا چاہتے ہو؟

اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے سارے ہی علوم انسان کی تجرباتی کاوشوں کے دائرے سے باہر نہیں ہوتے، وہ تو زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں افراد یا معاشروں کی ان معلومات پر مبنی ہوتے ہیں جو ابدی اور متیقن علمی اصولوں کے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں جاننے والے کا دین اثر انداز ہوتا ہے اور نہ اس کا مسلک پھر اس میں زبردستی اسلام کو کیوں داخل کیا جائے ؟ جبکہ وہ ایک محض دین ہے جو خدا اور بندے کے ربط و تعلق کو استوار کرتا ہے اور انسان کے عمل و کردار کی پاکیزگی کا کام انجام دیتا ہے ؟

جہاں تک علم و آگہی کا معاملہ ہے تو وہ ایک مشترک انسانی ورثہ ہے جو تغیر و تبدیلی کے معاملے میں انٹرنیشنل اور آفاقی ہے۔

ہمارے خیال میں پروگرام کے سمجھنے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی راہ میں ایک دشواری یہ حائل رہی ہے کہ عام طور سے لوگ علم، اس کے سرچشموں، اس کے مقاصد و حکمت اور ان اقدار کے مابین تفریق کرنے سے عاجز و درماندہ رہے ہیں جو تہذیبی فقدان کے نتیجے میں منتقل ہوتے رہے ہیں۔

لیکن جلد ہی تقلید پر مبنی یہ آوازیں پست ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ کمزور پڑنے لگیں بالخصوص جب اہل مغرب نے خود علم کے قافلے کو منضبط کرنے کے واسطے اقدار کی اہمیت پر زور دینا شروع کیا اور خود ان کی جانب سے اس طرح کی آوازیں بلند ہونے لگیں کہ علوم اور اقدار کے مابین ربط و اتصال ناگزیر ہے۔ نیز اہل مغرب کی جانب سے وضاحت کے ساتھ یہ بات آنے لگی کہ سائنس اور مذہب، سائنس اور حکمت کے مابین جدائی اور دوری کے نتیجے میں انسانی برادری کو کتنا بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا، مذہب اور سائنس کے درمیان خلیج حائل ہونے کا سبب یہ ہے کہ ماضی میں دین کے نمائندوں نے جو سب کے سب عیسائی تھے سائنس والوں پر ہر قسم کی زیادتی کو روا رکھا، ان کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا، فکر اور اہلِ فکر پر قدغن لگائے، سائنس کے خلاف جنگ چھیڑ دی، جس کا شدید ردعمل ہوا جس کے نتیجے میں

مذہب نے اپنا وزن اور وقار کھو دیا، علم و آگہی کو حقائق و مسلّمات کا درجہ دے دیا گیا۔ مذہب و سائنس کی دوری اور اس کے ردعمل کے نتیجے میں ڈاروِن اور مارکس کا بے دین فلسفہ وجود میں آیا اور اسی کے بطن سے وجودیت نے جنم لیا پھر انسان کی فکر اس کی تہذیب، اس کی تربیت و سیرت، اور اس کی تاریخ کے بارے میں گفتگو اس زاویۂ نگاہ سے ہونے لگی کہ وہ حیوانی تبدیلی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ چنانچہ انسان کی نفسیات اس کے محاکمے اور اصلاح کے سلسلے میں خالص مادی پیمانوں سے جو خیالات و نظریات سامنے آئے ان ہی کی روشنی میں انسانی و معاشرتی علوم اور جدید فنون و آداب کی خمیر تیار ہوئی۔

گذشتہ صدی کے اواخر میں جب مغرب نے بشمول عالم اسلام دنیا پر اپنا اقتدار قائم کیا تو اس کے بعد سے لوگوں کی نگاہ کے سامنے ہیں صرف اہل مغرب کی تہذیب و ثقافت آئی ۔ چنانچہ اب وہی ہر فکر و آگہی کا پیمانہ اور معیار قرار پا گئی، صرف یہی نہیں بلکہ مغرب کی سیاسی بالادستی کے ساتھ فکری یورش بھی شروع ہو گئی، دوسری قوموں کے جتنے بھی فکری اور ثقافتی قلعے تھے وہ ایک ایک کر کے مغرب کی فکری و تہذیبی یورش کے سامنے ڈھیر ہونے لگے۔ اگرچہ اُمّت مسلمہ بحیثیت مجموعی حملہ آور تہذیب و ثقافت کے سامنے سرنگوں نہ ہوئی بلکہ اس نے اپنی تہذیبی و تمدنی تاریخ کے حصار میں پناہ لی، اس حصار میں رہ کر اس نے اپنے تہذیبی وجود کو قائم رکھنے کی فکر وسعی کی، تاریخی و تہذیبی ورثہ کے حصار نے اگرچہ اُمّت کو مغرب کے تہذیبی دھارے میں بہہ جانے اور اپنی تہذیبی شناخت کھو دینے سے محفوظ رکھا لیکن طریقہ کار واضح نہ ہونے کی وجہ سے امت ترقی اور تمدنی تعمیر کے کاموں سے بیگانہ رہ گئی، اس کا فطری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ امّت کے بہت سے گروہ تہذیبی محرومی اور غالب قوم کی شیفتگی میں گرفتار ہونے سے محفوظ نہ رہ سکے۔ محض اس توقع میں کہ پسماندگی کی رکاوٹ دور کرنے، تمدن کے قافلے سے ہم رکاب ہونے، احساس کمتری کا ازالہ کرنے میں مدد ملے گی، گلے گلے مغربی تہذیب کو اوڑھ لیا اور ہر بات میں اہل مغرب کی نقالی شروع کر دی، لیکن ایسے لوگوں کو جو پھل ملا وہ بڑا ہی تلخ تھا۔ اپنی قومی شناخت کا فقدان فکر و نظر میں تذبذب، اور اسلامی جمعیت کا انتشار یہ ہے وہ کڑوا پھل جو اس طبقے کے حصہ میں آیا۔

موجودہ زمانے میں امت کے تعلیم یافتہ طبقہ کا جتنا اتفاق اس پر ہے کہ امت مسلمہ بالعموم اور عرب بالخصوص فکری بحران، ثقافتی فقدان اور علمی پسماندگی کا شکار ہیں اتنا اتفاق شاید ہی کسی دوسری چیز کے بارے میں ہو پھر اگرچہ اسباب کی تعیین اور وسائل علاج کی تشخیص کے بارے میں ان کے درمیان خاصا اختلاف ہے۔

فطری بات ہے کہ بحران کے احساس نے مسلمانوں کے سامنے بیداری اور ترقی کے متعدد منصوبے پیش کرائے، مختلف منصوبوں کے ضمن میں مختلف رائیں اور متنوع اجتہادی کاوشیں سامنے آئیں، مغربی منصوبہ بھی مختلف روپ اور متنوع لباس میں سامنے لایا گیا اس دعویٰ کے ساتھ کہ تہذیبی فقدان کے نتیجے میں بحران نہیں پیدا ہوا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے بحران پیدا ہوا ہے کہ مغربی منہج اور طریقہ کار کو صحیح ڈھنگ سے نہیں اپنایا گیا ہے۔ مذکورہ کوششوں کے ساتھ ہی ایسی کاوشیں بھی سامنے آئیں کہ ان کا مضمون تو مغربی منصوبے کا ہوتا البتہ ان پر رنگ وروغن اسلامی ہوتا۔

مغرب کے تمدنی منصوبے کی بالادستی کے دباؤ اور مسائل ومشکلات کے فکری اسباب کا جائزہ لینے کی بجائے مسائل کے نتائج وآثار ہی میں منہمک ہوجانے والے بعض منصوبوں نے عالم اشیاء کا تو کسی قدر اہتمام کیا لیکن عالم افکار کو توجہ وفکرمندی کا جو حصہ ملنا چاہیئے اسے وہ نہ دے سکے۔ کیونکہ ان منصوبوں میں جیسی پلاننگ ہونی چاہیے ویسی پلاننگ نہ تھی، نہ نظر کی وسعت تھی اور نہ غیر جانبداری اور نہ ہی اصلاح ودرستگی کے لئے کوئی مسلسل ومربوط طریقۂ کار۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے منصوبے یا تو جزئی نظریات پر مبنی تھے یا پیوندکاری والے (تلفیقی) نظریات پر چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ عمل اور تجربے کی کسوٹی پر یہ سارے منصوبے فیل ہوگئے اور بحران اور زیادہ سنگین ہوگیا۔

اس پس منظر میں کہ امت مسلمہ اور اس کے دشمنوں کے درمیان تلخ اور سنگین نوعیت کی کشمکش جاری رہی ہے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اہم اور بیشتر علاقوں پر دشمنوں کا قبضہ ہوگیا، کچھ علاقے ان کے زیر اثر اور زیر سرپرستی آگئے، کچھ خطے زندگی بخش میدانوں اور منڈیوں میں تبدیل ہوگئے۔ ان حالات نے اسلام کے تمدنی منصوبے کے ذمہ داروں اور کارندوں کو

آمادہ کیا کہ وہ فی الحال دو اہم اور بنیادی مسئلوں کو اپنی توجہ و محنت کا مرکز بنائیں۔ ایک طرف امت کے عقائد کی حفاظت کا سامان کریں تو دوسری طرف سیاسی محاذ آرائی کی راہ اختیار کریں ان دونوں محاذوں سے اگر کچھ وقت اور قوت بچ رہے تو اُسے فقہی مسائل میں صرف کیا جائے اس طرح کہ ان مسائل کو از سرِ نو چھیڑا جائے، ان کی شرحیں لکھی جائیں، ان کی تلخیص کی جائے اور مغرب کے قانونی مسائل سے ان کا موازنہ کیا جائے۔

جہاں تک فکری بحران کا تعلق تھا کہ اس کا مطالعہ کر کے اس کے اسباب کا پتہ لگا کر اور سابقہ میدانی تجربوں سے فائدہ اٹھا کر اس کے لئے کوئی شافی علاج تلاش کیا جائے پھر اس کی روشنی میں علمی و تہذیبی عمارت تعمیر کی جائے تو اس کے لئے جس مطالعہ اور تجزیہ کی ضرورت تھی اسلامی منصوبہ اس کا حق ادا کرنے سے قاصر رہا بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ وہ فکری بحران کی اہمیت کا پورے طور پر اندازہ ہی نہیں کر سکا۔ بعض لوگوں کی نظر کی رسائی بس یہاں تک ہو سکی کہ فکری بحران عقیدے میں نقص و فساد کا ایک مظہر ہے جب عقیدے کی اصلاح کا کام شروع ہو گا تو خود بخود اور قطعی طور سے فکری بحران کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔ بعض دوسرے لوگوں کی رائے ٹھہری کہ عمل و کردار کی اصلاح اور روحانی پہلو کو ترقی دینے سے مطلوبہ نتائج برآمد ہو جائیں گے۔ یعنی فکری بحران دور ہو جائے گا۔ کچھ اور لوگوں نے خیال پیش کیا کہ اگر اسلامی ورثہ (قدیم اسلامی کتابوں) کی نشر و اشاعت شروع کر دی جائے اور اسلامی معلومات کی مقدار میں اضافہ کر دیا جائے تو مطلوبہ اصلاح کا حصول آسان ہو جائے گا۔ ہم مذکورہ بالا چیزوں میں سے کسی کی اہمیت و قدر و قیمت گھٹانا نہیں چاہتے، ان میں سے ہر ایک کا ایک مقام ہے اپنی جگہ اس کی اہمیت ہے چنانچہ عقیدے کی سلامتی علمی و تہذیبی عمارت کے لئے بنیاد و محور کی تشکیل کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلاف نے جب عقیدے کے دور رس اثرات کو سمجھ بوجھ کر جان لیا تو انھوں نے اپنے اجتہاد و فکر کے ذریعہ عقیدہ کو لوگوں کی زندگی پر منطبق کیا پھر عقیدے کے ذریعے ان کے عمل و کردار کی اصلاح کی اس طرح عقیدے کی درستگی کے نتیجے میں نقص و عیب سے پاک علمی و تہذیبی عمارت تیار ہوئی لیکن جب سے عقیدے کی بحثیں جامد کلامی اصطلاحات اور علم کلام کے مخصوص سانچوں میں محصور

د محدود ہو کر رہ گئیں تو فکر رخصت ہو گئی جو عقیدہ کو عمل کی جانب موڑنے اور اس کو موجودہ حالات پر منطبق کرنے کا نتیجہ اور ثمرہ تھی اور عقیدہ کو اس قالب میں ڈھالنے کا ذریعہ تھی جو زمانہ سے ہم آہنگ ہو، اصلاحات کے لئے جتنی کوشش ہوئیں وہ کلامی مناظرے کے دائرے میں ہوئیں یا خالص نظریاتی مہم کے دائرے میں ہوئیں، عقیدے کو موجودہ حالات پر منطبق کرنے اور اس کے ذریعہ لوگوں کی سیرت و کردار کی اصلاح کے ضمن میں کوئی مناسب اور قابل ذکر کاوش سامنے نہیں آئی۔

عقیدے کا تعلق وحی الٰہی سے ہے جس کے ارکان متعین اور جس کے حدود و نقوش دائمی اور ناقابلِ تغیر ہوتے ہیں اس کے برعکس فکر خالص انسانی اجتہاد پر مبنی ہوتی ہے اس کے اپنے سرچشمے ہیں اس کے اپنے عناصر ترکیبی ہوتے ہیں اور اس کے اپنے وسائل و آلات ہوتے ہیں یہ درست ہے کہ اصلاحِ فکر کی عمارت کو درست عقیدہ پر استوار ہونا چاہیئے لیکن خالص کلامی مفہوم میں عقیدے کی صحت اور اس کی درستگی فکر اور اس کے مناہج کی اصلاح کی ضرورت سے بے نیاز نہیں کر سکتی ہے۔

انسانی فکر کیا ہے؟ وہ دراصل عقل جو محدود ہے اور وحی جو قید و بند سے آزاد ہے کے درمیان ربط، وحی کو حالاتِ حاضرہ پر منطبق کرنے اور اس کے ذریعہ حالاتِ حاضرہ کی اصلاح کا ثمرہ ہے لہٰذا عقیدہ جو وحی الٰہی پر مبنی ہے اور فکر جو انسانی کاوش سے عبارت ہے کے درمیان خلط و اشتباہ کا ازالہ اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے مقام و کردار کی معرفت ضروری ہے۔

بعض لوگوں کا رجحان یہ ہے کہ افراد امت کے ذہن و دماغ میں صحیح اسلام کے جو مفہوم رچ بس گئے ہیں اس میں تبدیلی اسی وقت رونما ہو گی جب وہ شہادت حق کا انکار کرنے لگ جائے، یہ خیال بڑی حد تک درست بھی ہے بشرطیکہ ہم اپنے جلو میں رکھیں اور اسکے ساتھ درست رویہ اختیار کریں کیونکہ یہ چیز اس علمی امکان کو وجود عطا کرتی ہے جس کی تعمیر صحیح طریقۂ کار کے ساتھ کرنے کے لئے ہم کوشاں ہیں لیکن جہاں تک اس وہم و خیال کا تعلق ہے کہ جوشیلی تقریروں اور مزید روحانی ترقی کا انجکشن لگا دینے اور اسلامی تاریخ کے روشن و تابناک کارناموں کی یاد دہانی کرا دینے سے امت کی رگوں میں نئی زندگی کا خون

دوڑنے لگے گا۔ اور صحیح علمی و تہذیبی عالم کو وجود میں لائے بغیر اسلامی زندگی، نئے اسلامی تمدن، اور متحد امت مسلمہ کی تعمیر کی جانب وہ از خود رواں دواں ہو جائے گی تو ہمارے نزدیک اس خیال میں حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کا فقدان ہے اور ظن و تخمین کا عنصر غالب ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں مشکلات کا حل تلاش کرنے کی بجائے مشکلات کے احساس ہی کو کافی کچھ سمجھ لیا گیا ہے موجودہ حالات جن کی سختیاں ہم جھیل رہے ہیں ہمارے اس قول کے لئے شاہد عدل ہیں۔
کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ حالات میں تاریخ کا مطالعہ، امت کو اس کے اسلاف کے شاندار کاموں کو یاد دلانا، مسلمانوں کے سامنے ان کے تمدنی تاریخ کے وجود کو دہرانا متوقع علمی عمارت کو وجود میں لانے کے سلسلے میں ایک ناگزیر تہذیبی و تمدنی ضرورت ہے۔ دشواری اور پیچیدگی یہ ہے کہ اس وقت کس قسم کے مضامین اُمت کے ذہن و دماغ کے لئے سودمند ہیں اور کس نوع کے مضامین غیر سودمند بلکہ مضرت رساں ہیں بسلسلہ حالات کا صحیح تجزیہ کرنے اور ان سے صحیح شرائط کو اخذ کرنے کا ہے۔ پریشانی یہ پتہ لگانے میں ہے کہ کون سے طبعی قوانین قوموں کی تعمیر و ترقی اور ان کی نشاۃِ ثانیہ کے کاموں میں موثر اور معین و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ حال کی درماندگی اور فکر کو کسی تمدنی عمل میں تبدیل کرنے پر عدم قدرت کی تلافی ماضی کے کارناموں پر فخر و مباہات اور ماضی کے دامن میں پناہ لینے کے ذریعہ کی جانے لگی ہے۔ کیونکہ ان حالات میں تعمیر و ترقی کا محرک و سبب بننے کی بجائے تاریخ ایک تہذیبی و تمدنی رکاوٹ بن کر رہ جاتی ہے۔

بعض لوگوں کو یہ وہم ہے کہ علم و آگہی کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا، بلکہ صاحب علم کا مذہب و مسلک ہی اس علم و آگہی کا بھی مذہب و مسلک ہوتا ہے علم و آگہی کے فلسفے اس کے اغراض و مقاصد اور اس کے اصل سرچشموں سے قطع نظر وہ صاحب علم کے افکار و نظریات کے تابع ہوتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص عقیدہ کے اعتبار سے مسلمان ہوگا، خواہ اسکے عقیدے نے کسی صحیح فکر کو وجود نہ بخشا ہو پھر بھی جو بھی تعلیم و آگہی اس کے دماغ میں جاگزیں ہوگی وہ فطری طور سے اسلامی تعلیم اور اسلامی آگہی میں ڈھل جائے گی۔ کیونکہ وہ علم صاحب علم کے ساتھ مسجد جائے گا۔ اسی علم کے ساتھ وہ شخص نماز پڑھے گا، حج کرے گا، عمرہ ادا کرے گا تو وہ علم بھی

مسلمان ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ خواہ وہ علم ڈارون، فرائڈ، مارکس، ڈیورانٹ، جان ڈیوی، ڈورکھایم جیسے بے دین مغربی فلسفیوں کے ذہن کی پیداوار ہو یا غزالی اور ابن تیمیہ کے ذہن و دماغ کی دین ہو۔

ایسے لوگوں کے ذہن میں امر واقعہ حد درجہ خلط ملط ہو گیا ہے کیونکہ علم و آگہی دراصل فلسفہ اور عقیدہ کی پیداوار اور اس کا ثمرہ ہے۔ اس لئے علم و آگہی پر فلسفہ و عقیدہ کی چھاپ لازمی ہے۔ اس چھاپ سے علم و آگہی کا جدا ہونا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے ایک طرف آگہی عقیدہ و فلسفہ سے خوشہ چینی کرتی ہے تو دوسری طرف تہذیبی کاوشوں کو وجود بخشتی ہے۔ اس طرح تہذیبی کاوشیں بھی فلسفہ و عقیدہ کے اثرات سے پاک نہیں ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت بہرحال ذہن سے اوجھل نہیں ہونی چاہیئے کہ ہر عقیدے کی الگ آگہی ہوتی ہے اور ہر آگہی کے اپنے مخصوص سرچشمے ہوتے ہیں اور خاص اغراض و مقاصد ہوتے ہیں۔ کسی دوسری ثقافت سے علم و آگہی کو مستعار لینا ایسا ہی ہے جیسے ایک درخت کے پھل توڑ کر دوسرے درخت میں آویزاں کر دیئے جائیں، یہ پھل نہ دوسرے درخت کے تنوں سے سیراب ہو سکتے ہیں اور نہ ان کی تازگی قائم رہ سکتی ہے۔

بعض دوسرے لوگوں کا گمان ہے کہ علمی و تہذیبی عمارت کی تعمیر کا کام اس طرح بروئے کار آ سکتا ہے کہ ابتدائی اور پرائمری کے مرحلے میں تلاوتِ قرآن اور فقہ کے گھنٹے بڑھا دیئے جائیں اور قدیم انداز و اسلوب میں کچھ اسلامی ترانے بچوں کو زبانی یاد کرا دیئے جائیں اگرچہ ان چیزوں کو ایسے فکری سانچوں میں منتقل کرنے کی قطعاً صلاحیت پیدا نہ ہو، جن میں امت کی زندگی اور اس کی سرگرمی موجزن ہو۔ آج یونی ورسٹیوں کے اندر اسلامی تہذیب و تمدن کے جو مضامین اور جس شکل میں پڑھائے جا رہے ہیں ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے ان کے مضامین قدیم ہیں، اسلوب روایتی ہے البتہ اس کی پیشکش نئی ہے۔ امت کی تعمیر و تشکیل میں صحیح طور پر نہ ان کے اغراض و مقاصد متعین ہیں نہ ان کے سرچشموں کا پتہ ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ اس کے سرچشمے کون سے ہیں اور اس کے فرائض کیا ہیں؟

ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض درسگاہوں میں اسلامی ترانوں اور شرعی علوم کے گھنٹوں میں اضافے کر دیئے گئے اس کے باوجود دشواری بدستور رہے اور بحران مزید مستحکم ہو گیا ہے۔

یونی ورسٹیوں کے اندر اسلامی تہذیب و تمدن کے جو مضامین پڑھائے جا رہے ہیں ان کا جو بھی نام رکھا جائے وہ تعلیم و تربیت کے منہج کی بحث و گفتگو سے بے نیاز نہیں کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید علم و آگہی کا منبع و سرچشمہ ہے لیکن آج اس کی تعلیم کا جو طریقہ ہے کہ مخارج سے حروف کی ادائیگی اور ترتیل و تجوید پر سارا زور صرف ہوتا ہے۔ لوگوں کو قرآن میں غور و فکر، عبرت پذیری، زندگی کی تعمیر میں قرآنی نقطۂ نظر استعمال کرنے کی بالکل تعلیم نہیں دی جاتی ہے اور نہ اس کام کے لئے طلبہ کی ذہن سازی ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر اصل مقصد کو نظر انداز کر کے ساری توجہ ذریعہ و وسیلہ پر صرف ہو رہی ہے ایسی صورت میں قرآن کے گھنٹوں میں اضافہ یا عدم اضافہ سے کیا فرق پڑے گا؟

بعض افراد کی رائے ہے کہ اگر ایسی یونیورسٹیاں کالجز، اور ایسے دینی ادارے وجود میں آجاتے ہیں جہاں خاص طور سے دینی علوم کی تعلیم دی جاتی ہو اور جہاں سے فارغین مسجدوں کی امامت' جمعہ کی خطابت' اور دیوانی کی قضاء کے عہدوں پر فائز ہو سکیں۔ تو سمجھنا چاہیئے کہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی زندگی سے مفقود تہذیب و ثقافت کی تلاش و جستجو میں کاوش و محنت کی حاجت ہے اور نہ انسانوں کی کردار سازی کی پرمشقت اور طویل پروگراموں کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اس کا کوئی داعی و محرک ہے۔

یہ ساری تدبیریں اور سارے ادارے ہمارے کسی کام اور کسی مصرف کے نہیں جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں علم و آگہی کی پیاس مغربی سرچشموں سے بجھا رہی ہیں انھوں نے اپنا رشتہ مغرب کے ان فکری سوتوں سے جوڑ رکھا ہے جن کی جڑیں یا تو اغریقی یا یونانی بت پرستی میں پیوست ہیں یا ان کا سلسلہ عیسائیت سے جا ملتا ہے۔ اس سے زندگی کا کوئی شعبہ پاک نہیں ہے تعلیم کا میدان ہو یا تربیت کا، نفسیات کا شعبہ ہو یا معاشرتی و انسانی علوم کا، سیاسیات ہو، اقتصادیات ہو یا فلسفہ، ایڈمنسٹریشن ہو یا ذرائع ابلاغ قانون ہو، فنون جمیلہ ہو یا آدابِ لطیفہ، یا انسانی علوم سے متعلق کوئی اور علم جن سے

کسی بھی قوم کے تہذیبی خدوخال نمایاں ہوتے ہیں اور اس کی شخصیت کے تمدنی نقش و نگار ابھرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جو علوم کسی قوم کی تہذیب کو وجود میں لاتے ہیں اور جن سے اس قوم کی ذہنیت پروان چڑھتی ہے۔

اس قسم کے بعض تصورات وخیالات دراصل ایک تصوّر کو ظاہراً یا نہاں خانۂ دل میں صحیح تسلیم کر لینے کا نتیجہ ہیں۔ اس تصوّر کا مفہوم یہ ہے کہ "مغربی تہذیب ایک عالمی تہذیب ہے اور مغربی علم ایک عالمی علم ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دونوں سائنٹفک بھی ہیں"۔ مغربی تہذیب اور مغربی علوم کی آفاقیت کا یہ تصور اور ان کے انٹرنیشنل ہونے کا یہ عقیدہ تہذیبی محرومی کے نتائج بد سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ اس طرح کہ بہت سے اسباب کے تحت کرۂ ارض پر بسنے والے کروڑوں انسانوں کے ذہن ودماغ میں یہ خیال وعقیدہ جاگزیں کرنے میں مغرب نے پوری کامیابی حاصل کر لی ہے۔

ایک دشواری جو ہماری عقلی زندگی کے ایک بڑے حصے پر چھائی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاص زمانہ میں اس دور کے مسائل ومشکلات کے حل کے وقت جن تصورات ومفاہیم نے جنم لیا تھا اور جو ہم تک سلسلہ وار منتقل ہو کر آئے ہیں ان ہی تصورات اور مفاہیم تک ہم نے اپنے کو محدود کر لیا ہے اس وقت ہمیں کن چیزوں کی ضرورت ہے ان کا پتہ لگانے کی قدرت وصلاحیت سے ہم محروم ہیں اب تک ہم یہ جاننے سے بھی قاصر ہیں کہ زیر بحث اسلامی منصوبہ ابھی مسئلہ کے حل کے لئے فارغ نہیں ہو سکا ہے بنیادی شکل میں ابھی اس کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے بلکہ ابھی وہ دفاعی پوزیشن میں ہے اور محاذ آرائیوں کا سامنا کر رہا ہے یا تو وہ خود اس کو اولیت دے رہا ہے یا تدریجاً حالات نے وہاں تک پہنچا دیا ہے۔ بہر حال محاذ آرائیوں کا سامنا کرنے اور دفاعی پوزیشن میں ہونے کی وجہ سے اصل مسئلہ کی جانب توجہ کرنے کی اسے ابھی مہلت نہیں مل سکی ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغربی تہذیب یا مغرب کے علمی منصوبے کو اعتماد ویقین کے درجے پر پہنچانے والے اسباب درج ذیل ہیں:

- مغرب کی بالادستی اور مغلوب قوم پر اس کے اثرات

- تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ترویج واشاعت
- تحقیق وایجاد اور اختراعی کاوشوں سے مسلمانوں کی کنارہ کشی اور دوسروں سے سیکھنے اور ان کی تقلید پر قناعت۔

اس بارے میں دونوں طرح کے لوگ یکساں ہیں ایک وہ جو اندرونِ اسلام کی تاریخ کا سہارا لیتے ہیں وہ اسلامی تاریخ کا صحیح مطالعہ کرنے اور اس سے صحیح نتیجہ نکالنے کی بجائے تاریخ کی زبان سے وہ بات کہلواتے ہیں جو ان کے لئے مفید مطلب ہو، دوسرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے آسانِ بدل کی راہ اپنائی، یعنی بالادست کے منصوبے پر تنقید وتجزیے کے بغیر ایمان لے آئے اور اپنے فکر وعمل کی بنیاد اسے بنا لیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بیچارا مقلد تنقید وتجزیہ اور موازنہ پر قادر ہی کب ہوتا ہے؟ تقلید تو عاجزی اور درماندگی ہی کا نام ہے جو پکے پکائے کھانے کو کھا لینے اور دوسروں کی تیار کردہ چیز کو اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

بلاشبہ دونوں قسم کے لوگ مقلد ہیں۔ اسلامی منصوبہ والوں کا عذر ہو سکتا ہے کہ وہ تہذیبی تاریخ کی نقالی کر رہے ہیں اگرچہ وہ تہذیبی تاریخ سے حال ومستقبل کے لئے کوئی مفید یا نئی چیز نکالنے سے قاصر ہیں۔ جہاں تک مغربی منصوبے کے داعیوں اور مبلغوں کا معاملہ ہے تو وہ پہلی قسم کے لوگوں سے کہیں زیادہ درماندہ اور تقلید کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کیونکہ اس تیار مال کے استعمال کی طرف ان کا جھکاؤ ہے جس کی تیاری میں نہ ان کا ہاتھ ہے اور نہ ان کے اسلاف کا، اس کو اختیار کرنے کے نتیجے میں پسماندگی میں مزید اضافہ ہوگا اور وہ قلق واضطراب نہیں پایا جائے گا جو بحران سے نجات حاصل کرنے کے لئے آدمی کو سوچ بچار پر آمادہ کرتا ہے بلکہ بے چین رکھتا ہے۔

اسلامی منصوبے کو جن طبقوں نے قبول نہیں کیا ہے ان کا پیش کردہ منصوبہ خواہ دنیوی منصوبہ کے نام سے ہو یا سیکولر منصوبے کے نام سے وہ مغربی فکر اور مغربی تہذیب کو اپنا لینے کا منصوبہ ہے قطع نظر اس سے کہ ان کے درمیان خود مختلف مکاتب فکر ہیں اور مغربی فکر وتہذیب کو اپنانے کے انداز اور طریقہ کار کے بارے میں تھوڑا بہت اختلاف

ان کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ بہرحال اس منصوبہ کا مغربی فکر و تہذیب کے سائنٹفک اور عالمی ہونے پر ایمان ہے۔ اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ فکر و تہذیب کا نہ کوئی اپنا مذہب ہوتا ہے اور نہ اپنا کوئی خاص وطن اور نہ جغرافیائی رکاوٹیں ان کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں فکر و تہذیب کی مثال ایتھر کی سی ہے۔ جب تک تمہارے دونوں کان صحیح سالم ہیں اور تمہاری دونوں آنکھوں میں بینائی موجود ہے فکر و تہذیب تم تک پہنچ کر رہے گی اور تمہارے ذہن و دماغ میں داخل ہو کر رہے گی۔ تمہارے چاہنے اور نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بیداری، ترقی اور زمانے کے ساتھ ہم رکابی کا کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جو فکر اور تہذیب سے ہو کر نہ گذرے، دنیا کی قضاء و قدر اور تہذیبی جبر کا یہی فیصلہ ہے۔

مسلم ممالک میں مغربی منصوبہ ناکام رہا، مغربی ممالک میں اس کے جو نتائج برآمد ہوئے ویسے نتائج مسلم ممالک میں برآمد نہیں ہوئے، بلکہ اس سے کم تر نتائج بھی سامنے نہیں آئے، کیونکہ وہ منصوبہ امت مسلمہ کی تہذیب و ثقافت سے ناآشنا تھا اور اس لئے بھی کہ مغربی منصوبہ ایسی ثقافتوں و تہذیبوں کا نتیجہ تھا جو تہذیبیں ہماری تہذیب سے میل نہیں کھاتیں، اس وجہ سے بھی کہ اس کے سائنٹفک ہونے کا جو دعویٰ کیا گیا تھا وہ بجائے خود محل نظر ہے۔ کیونکہ انسانی تحقیق و ریسرچ بھی خالص تجرباتی علوم کے معیار تک پہنچنے سے کہیں زیادہ تہذیبی نتائج کی حامل ہوتی ہے جو قوموں کی تہذیبی شکل و صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگرچہ خالص تجرباتی علوم بھی اپنے کام و آثار میں اپنے موجد کے فلسفہ، اس کی تہذیب اور اس کے منہج کے دائرے سے باہر نہیں ہوتے، کیونکہ انسان ہی اپنی تہذیب و پس منظر کے ساتھ تحلیل و تجزیہ کا وسیلہ اور ذریعہ ہے تو دوسری طرف وہ خود ہی ریسرچ و تحقیق اور تحلیل و تجزیہ کا محل و موضوع بھی ہے۔

امرِ واقعہ اور عملی تجربہ دونوں نے ثابت کر دیا ہے کہ مغرب کا تہذیبی وجود اُمت مسلمہ کے واسطے کچھ پیش کرنے میں یکسر ناکام رہا ہے۔ یہاں اس حقیقت کی جانب اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے استقراء، واقعات کے مطالعے اور اصلاحی کاوشوں کی تلاش و جستجو سے یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ اسلامی تعلیمات سے ہٹ کر بیداری اور نشأۃ ثانیہ کی جو بھی کاوش سامنے آئی وہ ناکامی سے دوچار ہوئی امت مسلمہ کو اس نے

کچھ نہ دیا۔ مغربی منصوبے کی پیہم ناکامیوں کے باوجود اس کے داعیوں اور مبلغوں نے ہمت نہیں ہاری، مغربی لادینی منصوبہ کو پیش کرنے کی اپنی کوشش دوبارہ شروع کر دی کہ اسے ایک موقع اور دیا جائے خواہ اس کے نتیجے میں اُمت کی اندرونی کشمکش میں مزید اضافہ ہو جائے۔ اور آئندہ صدیوں تک اُمت پسماندگی کے دلدل میں پھنسی رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی منصوبے کے داعیوں نے اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے، مغربی منصوبے کی ناکامی کا یقین ہو جانے اور اسلامی بیداری کے ظہور کے بعد فرض کر لیا کہ دو اسباب کی بنا پر مغربی منصوبہ دنیائے اسلام میں ناکام رہا اور ترقی و نشاۃ ثانیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ کر سکا۔

پہلا سبب: پہلا سبب خود مسلم ذہنیت کی فطری ساخت ہے۔ اپنے تکوینی عناصر کے ساتھ مسلمانوں کی ذہنیت ہی دنیائے اسلام میں مغربی منصوبے کی ناکامی کی اصل ذمہ دار ہے۔ چنانچہ مسلم ذہنیت کا خمیر جن موروثی عناصر سے تیار ہوا اور جن سوتوں سے اسے تراوٹ ملتی ہے ان کے سبب وہ مغربی منصوبے کو نہیں سمجھ سکی، یا غلط سمجھا اور ٹھکرا دیا، صحیح ڈھنگ سے اس کا استقبال نہیں کیا اور نہ اہل مغرب سے اس کو اچھی طرح حاصل کیا، یا اہل مغرب کی طرح صحیح ڈھنگ سے اختیار نہیں کیا، یہ اور اسی طرح کے دوسرے اسباب اس کی ناکامی کے ضمن میں بیان کئے جا سکتے ہیں ورنہ بذات خود وہ ایک کامیاب منصوبہ ہے جس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے ہر جگہ اور ہر زمانے میں اس کی کامیابی یقینی اور سائنٹفک ہے کیونکہ وہ انٹرنیشنل منصوبہ بھی ہے اور سائنٹفک بھی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ جاپان میں کامیاب ہوا۔ کوریا اور ہندوستان میں کامیاب ہوا۔ اور دنیا کے دوسرے ممالک میں کامیاب ہوا۔ اب رہی بات اس ناکامی کی یا اس کو ناکام بنا دینے کی تو اس کی پوری کی پوری ذمہ داری مسلم ذہنیت اور مسلمانوں کی تاریخی و موروثی تہذیب پر عائد ہوتی ہے اس لئے کہ مسلمانوں کی دینی ساخت، اس کی نفسیاتی ترکیب، اسلامی ورثہ، اس کی فکر کا تاریخی و لغوی پس منظر، ان سب نے مل کر مشترکہ طور سے مغرب کے تمدنی منصوبے کو ناکام بنایا ہے۔ اس لئے مغربی منصوبے میں اصلاح و ترمیم کی بجائے مسلم ذہنیت ہی کو مغرب کی آپریشن میز پر رکھا جائے اور اس کے امراض کا پتہ لگایا جائے اور اس کے بعض اجزاء اور جراثیم کو بالکلیہ ختم کر دیا جائے،

اور اس کی تشکیل جدید سے کام کا آغاز کیا جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ تہذیب، علم و آگہی، سرچشمے، نظم و ضبط، ورثہ، تاریخ اور زبان کی صورت میں جو چیزیں اس سے وابستہ ہوگئی ہیں ان سب کا از سر نو مطالعہ کیا جائے اور ان دریچوں کی اچھی طرح صفائی کر دی جائے جہاں سے مغربی افکار داخل کرنا ممکن ہو اور مسلمانوں کی ذہنیت سے ان اجزاء کو بالکلیہ نکال باہر کر دیا جائے جو مغربی افکار قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں تاکہ مسلمانوں کا ذہن مغربی افکار قبول کرنے کے لئے پورے طور پر تیار ہو جائے اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ یہ کاوش اس مرتبہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے، اور مغربی منصوبہ عالم اسلام میں مغرب سازی کے کام کا پہلا زینہ ثابت ہو، چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے مغرب کے بہت سے اہل تحقیق اور ریسرچ اسکالر کمر بستہ ہوگئے، سارے دھندے چھوڑ کر اس کام کے لئے فارغ ہوگئے، ان کے ہم رکاب وہ مسلمان بھی ہوگئے جو تہذیبی دائرے میں ان سے باہر نہیں ہیں اور ان گوشوں کی تلاش شروع کر دی جہاں سے اسلامی فکر میں دراندازی ہونا اور خود اسلامی فکر سے مغربی فکر کی صحت پر دلیل پیش کرنا آسان ہو اس ضمن میں انھوں نے ادب، تاریخ اور انسانی علوم کو بطور خاص اپنی دلچسپی و سرگرمی کا مرکز بنایا، ان کا خیال ہے کہ جن امور میں کامیابی کے لئے کوشاں ہیں ان میں مستشرقین کو مطلوبہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی، یہ سمجھتے ہیں کہ مستشرقین اور مغرب سازی کے ابتدائی حملوں کے قائدین نے اسلامی ورثہ (قدیم ماخذ) کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا۔ اسی طرح ان کے وسائل و ذرائع بھی اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے کہ وہ مسلم ذہنیت کا تکوینی اور دیگر دوسری حیثیتوں سے تحلیل و تجزیہ کرنے پر قادر ہوتے۔ چنانچہ بازاروں میں ایسی تحریروں اور کتابوں کا انبار لگ گیا جو سرمایہ (قدیم اسلامی ماخذ) معاصرت (زمانے کی ہمرکابی) عرب ذہنیت کی تکوین، عرب ذہنیت کی ساخت، عرب ذہنیت کا قتل، فکر اسلامی کی تکوین، اور فکر اسلامی کی تاریخیت جیسے موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ ہمیں پختہ یقین ہے کہ مستشرقین یکسر ناکام نہیں رہے بلکہ انھوں نے بھی یونی ورسٹیوں، درسگاہوں اور دیگر تعلیمی و تحقیقی اداروں میں ایسے مناہج فکر ایجاد کئے اور ایسی فضا بنائی جس کے پروردہ موجودہ رجحان اور اس کے حاملین ہیں جو دنیائے اسلام کے اندر رہ کر مغرب سازی کے کارواں کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

دوسرا سبب: دوسرے سبب کو پہلے سبب کا تکملہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مستشرقین نے قدیم اسلامی اصطلاحات کو مناسب طور پر استعمال کرنے کی اہمیت کی طرف دھیان نہیں دیا اور ایسے دریچے ایجاد نہیں کئے جو مغرب سازی والے مفاہیم کو مسلمانوں تک منتقل کرنے کے واسطے مطلوب تھے۔ مثلاً کسی مسلمان کے سامنے اشتراکیت کی دعوت دی جائے اور اسے یہ بتایا جائے کہ یہ مارکس، انجلز اور ان جیسے دوسرے فلسفیوں کے افکار و نظریات ہیں تو مسلمان اپنی تکوینی اور ذہنی ساخت اور اپنی موروثی تہذیب کے پیش نظر اسے قبول کرنے میں تذبذب و تردد کا شکار ہو جائے گا لیکن اگر اسی نظریہ کو اس کے جملہ اجزاء اور متعلقات کے ساتھ یہ کہہ کر پیش کیا جائے کہ یہ نظریہ حضرت ابوذر غفاری اور حضرت علی بن طالب رضی اللہ عنہما کے افکار و خیالات سے اور علامہ ابن خلدون کے نظریات سے باہر نہیں ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ یہ نظریہ فلاں فلاں امام کی فقہ کے تحت آتا ہے تو مسلمان بلا تامل اس نظریہ کو قبول و اختیار کرے گا۔ اسی طرح جب اشتراکیت کی انٹرنیشنل تحریک میں شرکت کی دعوت یہ کہکر دی جائے کہ یہ سامراجیوں اور استحصال پسندوں کے خلاف فقراء و مساکین اور محروم طبقہ کے مفاد کی جنگ اور جدوجہد کا نام ہے تو وہ اسے ضرور قبول کرے گا۔ بالخصوص ایسی صورت میں جب اسے بتایا جائے کہ اس تاریخی دعوت کی شروعات اسلام سے ہوتی ہیں مسلمانوں میں ایسی تحریکیں اٹھی ہیں جنھوں نے بعینہ یہی باتیں کہی ہیں اور یہی نعرے لگائے ہیں اس طرح خوارج اور شیعوں کی تحریکات کا دوبارہ مطالعہ شروع ہوگا۔ مثلاً قرامطہ کی تحریک اور زنجیوں کی تحریک کا ازسرنو جائزہ لیا جائے گا تاکہ اسلامی تاریخ سے مطلوبہ نتائج نکل آئیں اور مذکورہ باتوں کو قبول کرنے کا میدان فراہم ہو جائے، اسی طرح ڈیموکریسی کے بارے میں کہا جائے کہ یہ تو بعینہ شوریٰ ہے یا جمہوریت کے متعلق کہا جائے کہ یہ اسلامی خلافت سے جدا کوئی چیز نہیں ہے تو اسے قبول کرنے میں ایک مسلمان کو کیا تامل ہوگا؟

جب امت اسلامی تہذیب کی ترتیب سے دور ہٹ جاتی ہے۔ تہذیبی طور پر اسے گمراہ کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس کے سامنے مغربی افکار، اغریقی، مشرکانہ اور صلیبی آلائشوں کے ساتھ پیش کئے جانے لگیں، ڈارون، فرائڈ، مارکس، سارتر،

اشتراکیت اور لبرل ازم کے نظریات یہ کہہ کر پیش کئے جائیں کہ یہ غزالی، ابن رشد، ابن سینا اور ابن خلدون کے نظریات ہیں تو تم دیکھو گے کہ مسلمان ان نظریات کو بآسانی قبول کرلیں گے اسی لئے آج ہم دیکھتے ہیں کہ تغریب مغرب سازی کے داعیوں کی ایک جماعت اسلامی تاریخ اور قدیم اسلامی مآخذ کا گہرائیوں کے ساتھ مطالعہ کرنے میں منہمک ہوگئی ہے۔ اور بہت سے فکری نظریات جن کی عمر ابھی ایک صدی سے زیادہ نہیں ہوئی ہے ان کو اسلامی قضیوں سے جوڑنے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ اور اسلامی میدان میں کھچڑی اصطلاحات کی یورش شروع ہوگئی ہے۔ مثلاً اسلامی دایاں بازو، اسلامی بایاں بازو وغیرہ، اس مقصد کے تحت صحابہ کرام اور تابعین عظام کی خانہ بندی شروع ہوگئی ہے کہ فلاں فلاں صحابہ لبرل تھے۔ فلاں اور فلاں ڈیموکریٹ تھے اور فلاں فلاں اشتراکی نظریات کے حامل تھے یہی معاملہ تابعین کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔

اسی طرح بعض مغربی افکار و خیالات پر قدیم مفاہیم و اصطلاحات کو منطبق کیا جانے لگا تاکہ قدیم اصطلاح کے پردے میں اس جدید نظریہ کے لئے جواز فراہم ہو جائے۔ چنانچہ اس نوع کے آرا، اجتہاد کے نام سے پیش کئے جاتے ہیں۔ خارجیت اور رافضیت کو تجدید قرار دیا جاتا ہے ایسے ہی جیسے بے حجابی اور عریانیت کو آرٹ کا نام دیا جانے لگا ہے۔ مفہوم اور افکار کا مسئلہ بڑا نازک اور اہم ہے اس پر الگ مستقل بحث ہونی چاہیئے۔

اسلامی منصوبہ کو اہتمام و فکرمندی کا وہ حصہ نہیں مل سکا جس کا وہ مستحق تھا اسی سبب سے وہ اپنا مقصد پورا کرنے سے قاصر رہا، خطرناک فکری امراض کا تسلسل قائم رہا، مثلاً اجتماعی تقلید کی حکمرانی، قوانین فطرت سے غفلت، اور اسلام کے عالمگیر ہونے سے چشم پوشی یا اسلام کو غلط طور پر سمجھنا، اسی طرح بیرون اسلام سے ان پر جو محاذ آرائی مسلط کی گئی اس نے بھی موقع نہیں دیا کہ فکری مسئلہ کو مطلوبہ اہتمام مل سکے، حالانکہ اس محاذ آرائی نے میدانی فقہ کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے اور فکری قضیے کی نزاکت و اہمیت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ مغرب سازی والے منصوبے کی ناکامی کے اسباب میں غور و فکر کرتے وقت ان فرائض اور تمدنی ضروریات کا شدت سے احساس ہوا اور شدید تقاضا ہوا کہ "مناہج فکر کی اصلاح اور علم و آگہی کو اسلامیانے کا

قضیہ" زیر بحث لانا چاہیے تاکہ تلافیٔ مافات کی ایک اور کوشش ہو جائے اور اسلامی منصوبہ کو زیر بحث لاکر اس کو مکمل کر لیا جائے۔

بلاشبہ فکری و تہذیبی منصوبہ ان ذاتی اسباب کا پتہ لگانے اور ان کو دور کرنے کے لئے کوشاں ہے، جن اسباب کی وجہ سے گذشتہ منصوبے ناکامی سے دوچار ہوئے اور مطلوبہ نتائج برآمد کرنے سے قاصر رہے۔ اس طور پر کہ یہ منصوبہ اسلامی اور بنیادی سرچشموں، وسعت نظر، توازن واعتدال اور ضبطِ تناسب کو خصوصی اہمیت دیتا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں جہاں زیر بحث فکری و تہذیبی منصوبہ کے لئے امتیازی اوصاف کا درجہ رکھتی ہیں وہیں ایک زبردست ذمہ داری بھی ہیں۔ کیونکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ امت جو پسماندگی کی خلیج پاٹنے کے لئے کوشاں ہے اور ایک نئے تمدنی دور کا آغاز کرنا چاہتی ہے جو امت مسلمہ کی نجات، اس کی از سر نو تشکیل، اور نئی اسلامی زندگی کی ابتدا پر ختم نہیں ہوگا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ستم رسیدہ انسانیت جو فنا کے گھاٹ اترنے کے قریب ہو چکی ہے اس کو تباہی سے بچائے گا اور امت کو تمدنی وجود کے مقام پر فائز کرے گا جو اس کے پیغام کا اصل جوہر ہے۔ ان ساری چیزوں کا مستقبل اس منصوبے کی کامیابی سے وابستہ ہے لیکن بہر حال اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ماضی میں جو فکری و اصلاحی منصوبے بروئے کار لائے گئے ہیں ان کے فکری سرمایوں سے بے نیازی برتی جائے گی، ان سے گریز کیا جائے گا یا ان کو پھلانگ کر آگے نکلنے کی راہ اپنائی جائے گی بلکہ ان کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے ان کو صحیح سمت عطا کیا جائیگا۔ اسی طرح نشاۃ ثانیہ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی غرض سے جو متنوع اسلامی منصوبے زیر عمل لائے گئے ہیں ان کے عملی تجربوں سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

بحران کی تاریخی بنیادیں

امت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی جدوجہد میں بحران کی تشخیص ضروری ہے اور بحران کی صحیح تشخیص کے لئے تاریخ کا جائزہ اور حالات حاضرہ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ نشأۃ ثانیہ اور مستقبل میں جھانک کر اپنے مقام و انجام کا پتہ لگانے کا کوئی بھی کام اس وقت تک نا تمام رہے گا جب تک تاریخ کا مطالعہ، موجودہ حالات کا جائزہ، احتسابِ ذات، گذشتہ منصوبوں کی تصحیح، درماندگی اور بے چارگی کے اسباب کی تعیین، اور ان مقامات کی تحدید نہ ہو جائے جہاں جہاں کمزوریاں موجود ہیں ان مقامات سے گذرنے کے بعد ہی ہم نے تشخیص کی ہے کہ امت جس بحران سے دوچار ہے وہ فکری بحران ہے۔ ہماری رائے میں وہ سارے بحران جن کو ہم ایک سے زائد پہلوؤں میں دیکھ رہے ہیں وہ سب اسی بحران کا نتیجہ اور مظہر ہیں۔ یا کسی خاص متعین پہلو میں اس کا انعکاس ہے۔ ہماری نگاہ میں فکری بحران ہی سارے بحرانوں کی جڑ ہے اور سب سے سنگین روگ ہے ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے چہ جائیکہ اپنی زبان پر یہ بات لائیں کہ فکری مسئلہ تاریخ کے ابتدائی زمانے میں خلافتِ راشدہ کے آخری ایام یا اس کے بعد ظہور میں آیا، لیکن اس کا انکشاف نہیں ہو سکا یا اس کا انکشاف تو ہوا لیکن اس کے تدارک کے واسطے کسی کے اندر جنبش پیدا نہیں ہوئی، یہاں تک کہ ہم اس کام کے لئے اٹھے، اس کا تو ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہے اور نہ کبھی ہمارے دل میں اس قسم کی بات کھٹکی ہی ہے چہ جائیکہ ہم اس کا دعویٰ کریں یا ہمارے قلم سے ایسی کوئی تحریر نکلے۔ البتہ جو بات ہم پوری قوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب سے فکری و تہذیبی بحران شروع ہوا ہے اسی وقت سے یہ بحران امت کے نزدیک ناپسندیدہ اور مبغوض رہا ہے اور اسی وقت سے اصلاح

و تجدید کے کاموں کا بھی آغاز ہوا ہے' اس کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ہماری آج کی دعوت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ خواہ ہم فکری بحران کا نقطۂ آغاز امامت کبری اور امت کی قیادت کے مسئلہ کو قرار دیں، اور اس کے کردار، اس کی طبیعت، اس کے دینی و دنیاوی اثرات کی فہم میں اضطراب کو ٹھہرائیں یا اس بات کو ٹھہرائیں کہ امامت و قیادت کا مسئلہ عقل و نقل کی بنیاد پر بحث و مناظرہ کے میدان میں تبدیل ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں سیاسی اور فکری قیادتیں جدا جدا ہو گئیں، فکر و سیاست کی دوئی کا ثمرہ یہ برآمد ہوا کہ انحرافات اور تقسیم در تقسیم کا ایک تسلسل قائم ہو گیا، یا فکری بحران پیدا ہونے کا نقطۂ آغاز عالم شہادت اور عالم غیب کے درمیان خلط و اشتباہ کو قرار دیں جس کی وجہ سے تقدیر (جو ایمان کے ارکان میں سے ایک رکن ہے) انسان کے فعل، ارادۂ فعل، آزادی، فعل کے سلسلے میں انسان کی ذمہ داری کے درمیان معاملہ گڈمڈ ہو کر رہ گیا پھر اس کے نتیجے میں فکری انحراف اور سیاسی تقسیم کا عمل شروع ہو گیا۔

بہرحال ان دونوں میں سے جس کو بھی فکری بحران کا نقطۂ آغاز قرار دیں، ان انحرافات کے مقابلے میں فکری کاوشیں سامنے آئیں جو تاریخ کے اندر ریکارڈ ہیں۔ ان کاوشوں پر نظر ثانی ان کو صحیح سمت دینے اور ان کو نئے قالب میں ڈھالنے کی ضرورت ہے تاکہ ان سے موجودہ اسلامی فکر کے سلسلے میں فائدہ اٹھایا جا سکے، البتہ تاریخی سرمائے سے مراجعت کے وقت قدیم فکری اور کلامی معرکوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور بغیر دشمن کے جہاد سے گریز کرنا ضروری ہوگا۔ اس تاریخی سرمایہ کی طرف رجوع نیز لوگوں کی زندگی پر وحی کے اقدار کو منطبق کرتے وقت دین اور وحی الٰہی جو کہ معصوم ہیں اور انسانی اجتہاد جس میں خطاء و صواب دونوں کا احتمال ہے دونوں کے درمیان فرق و امتیاز کرنا ہوگا، اور اس حقیقت کو سامنے رکھنا ہوگا کہ انسانی فکر اور انسانی اجتہاد یکساں طور سے خطاء و صواب کا احتمال رکھتے ہیں وحی الٰہی کو جو تقدس حاصل ہے وہ ان کو حاصل نہیں ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے بعض لوگ قدیم علمی سرمائے کا دفاع کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بعینہ دین و وحی الٰہی کا دفاع کر رہے ہیں۔

اس دائرے میں (اصلاح اور فکری بحران کو دور کرنے کی کوششوں کے دائرے میں) سنت کی جمع وتدوین کے سلسلے میں ہونے والی کاوشوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح وضعِ حدیث، اپنا مطلب نکالنے کے لئے حدیث کا ناجائز استعمال، اور حدیث کو کھلواڑ بنانے کی نازیبا حرکتوں سے حفاظت کی غرض سے جو قواعد وضوابط بنائے گئے ہیں اور اس ضمن میں جو کوششیں کی گئی ہیں ان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح عقل ونقل کے حدود متعین کرنے، نص اور عقل کے کردار کو منضبط کرنے، تفسیر وتاویل اور اصول فقہ کے قواعد کی تدوین، مشکلات القرآن اور مشکلات الحدیث، احادیث کے درمیان تعارض دور کرنے کے سلسلے کی تحریریں، انسانی ارادہ اور انسانی عمل کے ضمن میں ہونے والے مناقشے، حسن وقبیح شرعی اور عقلی کے مباحث، انسان کی آزادی واختیار کے سلسلے کی بحثیں ان ساری چیزوں کو اسی دائرے میں سمجھنا چاہیے۔

نقل (قرآن وحدیث) کو منضبط کرنے کی غرض سے طریقہ کار وضع کرنے، فکر ونظر کے لئے منہج تیار کرنے، عقل کے استعمال، اس کے میدان، اور اس کے ضوابط متعین کرنے کے لئے جو زبردست کوششیں صرف کی گئی ہیں ان سے عظیم تہذیبی ورثہ اور بڑا فکری سرمایہ جمع ہو گیا ہے یہی تہذیبی ورثہ گذشتہ طویل صدیوں میں اُمت کی وحدت کا ضامن بنا ہے۔ اور جس وقت سے امت مشکلات سے دوچار ہوئی ہے اور اس میں پیچھے ہٹنے کا عمل شروع ہوا ہے۔ اس وقت سے وحدتِ امت ایک دائمی حقیقت کی طرح برقرار ہے کیونکہ جماعت (جماعتِ مسلمہ) کے دل کی گہرائیوں میں وحدت کا مفہوم باقی رہتا ہے اور اسے دین کے ایک جزء ہونے کی حیثیت حاصل رہتی ہے۔

چنانچہ امام شافعی، امام ابن حنبل، عبدالرحمٰن بن مہدی اور ان کے ہمراہ دیگر مجتہدین نے منہج سازی ہی کی خدمت انجام دی ہے۔ امام ابوالحسن اشعری نے اسلامیین کے مضامین جمع کئے، ان کا تجزیہ کیا، ہر ایک کی اصل معلوم کی، اس کام میں محنت وجانفشانی کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اُمت کے پاس جو کلامی طاقت ہے اسے بیرونی میدان میں صرف کیا جائے۔ اور عقیدہ کے ارکان کے بارے میں ایسا خلاصہ اور نچوڑ پیش کریں جس پر زیادہ سے زیادہ

اتفاق ممکن ہو، اسی طرح امام الحرمین نے سیاسی امامت کے مسئلہ کا اس طرح تجزیہ کیا کہ بحران کے میدان سے نکال کر حل کے دور میں داخل کر دیا۔

امام غزالی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں نظریہ اور تطبیق کے مابین علیحدگی کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ یونانی چیلنج کے جواب میں ''تہافت الفلاسفہ'' تصنیف کی، اور اسلامی بدل پیش کیا، مسلم ذہن کے بحران کے بہت سے اسباب کا پتا تو حل پیش کیا یا اس کا اسلامی بدل پیش کیا، نیز مکمل اسلامی علم و آگہی کا نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی۔

ابن رشد نے بھی شریعت اور حکمت کے درمیان موہوم تضاد اور وحی و عقل کی دوئی کو دور کرنے کی سعی و کاوش کی، فقہی اختلاف کو اجتہاد کے ایک زندگی بخش سرچشمہ میں بدل دیا، اور اسے نئی چیز وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا جو تمام حالات و معاملات میں ہر نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہو فقہی اختلاف کو مشکل مسئلہ اور بحران کے دائرے سے نکال کر ایک ایسے میدان میں لانے کی کاوش کی جس میں مثبت پہلو، زرخیزی، نمی، تنوع، بات چیت اور تعدد ہے جس نے جملہ ممکن احتمالات کا احاطہ کر لیا ہے۔ ابن حزم نے بہت سے فکری اور منہجی قضیے طے کیے، اولین سرچشموں کی طرف لوٹنے، خیر القرون کو معیاری طریقہ کا مقام دینے اور اس عہد کے طریقہ کار کے التزام کے سلسلے میں انھوں نے جو کردار انجام دیا ہے اس کو فراموش کر دینا ممکن نہیں ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ نے بحران اور منہج کے مسئلے پر منطق، فقہ، اور شرعی سیاست کے دائرے میں کلام کیا ہے اور ایک وسیع تہذیبی اور فکری اصلاح کی تحریک چلائی ہے جس نے اُمت کے بہت سے مسائل کا عملی حل پیش کیا ہے ان کی تحریری کاوشوں کا مطالعہ کرنے والا مذکورہ بالا پہلوؤں میں سے ہر پہلو میں کارہائے نمایاں دیکھے گا۔

ابن خلدون نے جب دیکھا کہ تمدن کا کارواں رک گیا ہے بلکہ اس کا رُخ اب پیچھے کی طرف ہو گیا ہے تو انھوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرتی علوم کی اصول سازی کی تحریک شروع کر دی تاکہ فکری مضمون اور تہذیبی نظام کی تشکیل کا کام مکمل ہو جن کی مسلم آبادی کو شدید ضرورت تھی تاکہ مضبوط علمی بنیاد پر اپنا تمدنی کردار انجام دینا دوبارہ شروع کر دے۔ اگر ابن خلدون کے تہذیبی منصوبے کی تکمیل ان کے زمانے میں مقدر ہوتی تو تاریخ کا

دھارا بدل چکا ہوتا، لیکن مسلم ممالک میں ابن خلدون کی کوششوں کا تسلسل جاری نہ رہ سکا پھر یہ ہوا کہ عالم اسلام نے اپنے آپ کو ایک طویل نیند کے سپرد کر دیا، ایک ایسے وقت میں جبکہ اہل مغرب نے ان کی فکر کو حاصل کیا اس میں مصروف رہے اور اپنی زندگی میں اس کو جذب کر لیا، چنانچہ اہل مغرب کی بیداری اور نشأۃ ثانیہ کے دیگر اسباب میں سے ایک اہم عنصر یہ بھی تھا۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ امت کی طویل فکری تاریخ میں بحران کا احساس کبھی موقوف نہیں ہوا۔ اور نہ ہی حل اور علاج پیش کرنے کی کاوشیں کسی روز رکی ہیں۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ہماری فکری زندگی میں ہمارے فکری و تہذیبی سرمائے کو مناسب مقام نہ مل سکا، ساری توجہ کا مرکز سیاسی تاریخ رہی ہے جو بادشاہوں اور سلاطین کی تاریخ سے عبارت ہے۔ غالباً بحران کے اہم سرچشموں میں سے ایک اہم سرچشمہ سیاست کا اہتمام اور فکر و تہذیب کے ساتھ بے توجہی برتنا ہے۔

اس کے بعد اصلاح کی متعدد کاوشیں سامنے آئیں جو میدانِ عمل اور مقام عمل کے اعتبار سے باہم مختلف تھیں لیکن اس نقطہ پر متفق تھیں کہ امت کو اصلاح و تجدید کی کاوشوں کی ضرورت ہے۔ بطور مثال شاہ ولی اللہ دہلوی، شیخ محمد بن عبدالوہاب، امام شوکانی، آلوسی، طباطبائی، سنوسی، اور مہدی پھر اس کے بعد جمال الدین افغانی اور ان کا مکتب فکر، عبدالرحمٰن کواکبی، ابن بادیس، شیخ حسن البنا شہید، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بسید قطب شہید، مالک بن نبی، تقی الدین نبہانی وغیرہ دوسرے حضرات کے اسماء گرامی اور اصلاح و تجدید کے میدان میں ان کی کاوشیں پیش کی جاسکتی ہیں، ان مصلحین اور داعیوں نے فکری و تہذیبی پہلوؤں میں سے کسی نہ کسی پہلو کو اختیار کیا، امت کی مشکلات کے احاطے کے اعتبار سے ان میں سے بعض تحریکیں نمایاں ہوئیں، بعض نمایاں نہ ہوسکیں، بعض کا دائرہ وسیع تھا اور بعض کا تنگ، مذکورہ تحریکوں کے ابھرنے اور سکڑنے میں معاشرے کا دباؤ اور مصلح کی پرورش و پرداخت اور اس کے جہاد کا پس منظر اور مخصوص حالات بھی اثر انداز ہوئے، یہاں تک کہ متنوع اصلاحی افکار دو بنیادی منصوبوں میں سمٹ آئے، جن کا ذکر ہم پہلے بھی ترقی و تعمیر کے دو منصوبوں کی حیثیت سے کر آئے ہیں۔

جدید تحریکی اسلامی منصوبہ: اس کی نمائندگی وہ ردعمل کرتا ہے جو مسلمانوں کی سیاسی آزادی کے لئے سامنے آیا، اسی طرح سامراجیت دوسروں کے علاقوں پر ناجائز قبضہ اور وحدتِ اُمت کو نقصان پہنچانے والی کارروائیوں کے خلاف محاذ آرائی کی غرض سے امت کو جہاد کے لئے تیار کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ محاذ آرائی والے حالات کا تقاضا ہوا کہ اول درجے کی دفاعی تیاری کا منصوبہ اپنایا جاتے۔

مغربی قالب میں ڈھالنے والا سیکولر منصوبہ: جس کی نمائندگی تقلید اور مغرب کی نقالی کی ترغیب دینے والا رجحان کرتا ہے اس منصوبے کے داعیوں کا خیال ہے کہ صارفین کی ضرورت کے تحت جس طرح مادی چیزیں درآمد کی جاتی ہیں اسی طرح افکار و نظریات بھی درآمد کئے جا سکتے ہیں اور درآمد شدہ افکار کی بدولت ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔

امت کے تہذیبی ورثہ سے دوری اس کے تاریخی و تمدنی وجود کی نقالی سے عاجزی اُمت کے نفسیاتی اور معاشرتی تقاضوں سے بے اعتنائی برتنے' اور منصوبہ کے حامیوں کے سامراجی اور استحصالی اعمال کی بدولت مغربی قالب میں ڈھالنے کا داعی منصوبہ ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے میں ناکام ہوگیا، اسلامی تحریکی منصوبہ اپنے تمام مقاصد کو بروئے کار لانے سے پہلے ہی لڑکھڑا گیا اس لئے کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد محاذ آرائی کی تیاری' اُمت کے اندر اسلام کے بارے میں اعتماد بحال کرنے' اسلام کی طرف نسبت کی تجدید جیسے دیگر کاموں میں مشغول ہو کر رہ گیا جس کی وجہ سے فکری مسئلہ کو توجہ و اہتمام کی مطلوبہ مقدار دینے کا اسے موقع نہیں مل سکا، بجز اس مقدار کے جس کے ذریعہ تحریکی تیاری اور امت کے وجود کو نشانہ بنانے والے بحران کی محاذ آرائی میں شرکت ہو رہی تھی نتیجہ یہ نکلا کہ بحران بدستور قائم رہا۔

اسی طرح زیرِ بحث فکر" بحران کی فکر" ہو کر رہ گئی جس کے مخصوص حالات' وسائل و ذرائع، اور متعلقات ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکی منصوبے کے تحت جو ادبی سرمایہ تیار ہوا اور جن فکری کاوشوں نے اس میں حصہ لیا ان میں سے بیشتر دفاعی فکر کے زمرے میں آتی ہیں کیونکہ تحریک کے مخالفین ان کے سامنے طرح طرح کے مسائل کھڑی کر دیتے قسم قسم کے الزامات عائد کرتے، جن کا جواب دینا ناگزیر ہوتا، اس طرح تحریک سے وابستہ افراد کی توجہ

فکرمندی اور سرگرمیوں کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا، جس کے نتیجے میں ان کی سرگرمی ردعمل تک محدود ہو گئی مزید برآں یہ کہ تحریکی منصوبے سے وابستہ افراد کے معاصر سیاسی پارٹیوں کی مانند محاذ آرائی اور تنظیمی امور میں انہماک کی وجہ سے غور و فکر، نظریہ سازی، اصلاح اور نظرثانی کے لئے پورا موقع نہیں مل سکا، بجز کچھ فکری کاوشوں کے جو مطلوبہ مقدار سے بہت کم تھیں۔ اس صورت حال نے تحریکی منصوبے کو فکری حل، اور فکری علاج کا ضرورت مند بنا دیا جس میں دفاع اور تیاری سے زیادہ تعمیر و تشکیل کا اہتمام ہوتا ہے اس لئے کہ اگر اندرونی طور سے دفاعی تعمیرات نہ ہوں تو بیرونی اور خارجی دفاع اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے۔

دفاعی تیاری کے طریقۂ کار کو اگرچہ بعض کامیابیاں حاصل ہوئیں لیکن ساتھ ہی بعض منفی چیزیں بھی سامنے آئیں جن کے بارے میں نظرثانی کی ضرورت تھی، غالباً ان میں سب سے زیادہ خطرناک اسلام پسندوں کے درمیان اس ذہنیت کا عام ہونا تھا جو صحیح مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کے وسائل و ذرائع کے جواز کا فتویٰ صادر کرتی ہے۔ اپنی ذات کو ذمہ داری سے بری سمجھتی ہے، نظرثانی اور مراجعت کی ہر تجویز کو ٹھکرا دیتی ہے۔ ناکامی اور پیہم پسپائی کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتی ہے، ہماری اس صراحت سے ان فکری آراء کی اہمیت کی نفی نہیں ہوتی جو بحران کی فکر سے آزاد ہیں لیکن ایسی رائیں اس درجہ کم ہیں کہ بہاؤ یا دھارے کی شکل اختیار نہ کر سکیں جس کے ایک سے زائد اسباب ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پارٹی کی مشینری کی جانب سے ان رایوں کا گھیراؤ ہوا، ان پر نکتہ چینی کی گئی اور ان کو ٹھکرا دیا گیا، ان آراء کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ مرض کا تجزیہ اور اس کے اسباب کا جائزہ لیتی تھیں اور ذات و شخص کی ذمہ داری پر زور دیتی تھیں۔

"قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ" (آل عمران: ۱۶۵)

"اے نبیؐ کہہ دیجئے کہ وہ تمہاری اپنی وجہ سے ہے۔"

وہ رائیں صحیح منصوبہ بندی کی اہمیت اجاگر کرتی تھیں، کوتاہی کے اسباب کا پتہ لگانے اور ان فکری امراض کی تشخیص پر زور دیتی تھیں جن فکری امراض نے حالات کو بگاڑنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان رایوں کو قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ مسلم ذہن کی دوبارہ

تعمیر و تشکیل کی جاتی، لیکن تقلیدی ذہن کے مالک عوام اور بعض ان قائدین نے کھل کر مذکورہ بالا آراء کی مزاحمت کی جنھوں نے اپنی ذات اور اپنی شخصیت کو بطور حل پیش کیا تھا۔ ایسے قائدین پر یہ بات گراں گزرتی ہے کہ کوئی انھیں یہ محسوس کرائے کہ وہ بھی بحران کا ایک جزء ہیں۔

مقام مسرت ہے کہ آج اسلامی میدان میں کام کرنے والوں میں سے بعض افراد کو ان افکار و آراء کی جانب تنبہ ہونے لگا ہے اور انھوں نے اُن آراء کی اہمیت کا ادراک اور اس سے استفادہ کی کوشش شروع کر دی ہے۔ مثال کے طور پر مالک بن بنی کے افکار و خیالات ہیں۔ افسوس ہے کہ بعض جزئی نظریات اور تنگ گروہ بندی کے سبب تحریکی منصوبہ نے ان کے خلاف حصار قائم کیا اور بالآخر ان کی شخصیت سے محروم ہو گیا اس لئے آج المعہد العالمی للفکر الاسلامی جیسے ادارے کا اولین کام یہ ہونا چاہیے کہ اصلاح اور نشأۃ ثانیہ کی جملہ تحریکوں کا مطالعہ کرے، بالخصوص ان تحریکوں کا جن کی منہج اور عالم افکار کی تطہیر کے میدان میں بحران کی اصلاح اور ناکامی کے اسباب کی تعیین میں اچھی شرکت رہی ہے تاکہ معہد مطلوبہ کردار کی انجام دہی پر قادر ہو سکے، معاصر اسلامی زاویۂ نگاہ کو مالا مال کر سکے اور گذشتہ نقطہائے نظر سے صحیح علمی صورت میں استفادہ کرنے کے لائق ہو سکے۔

ہم اپنی بات کا ایک بار پھر اعادہ کرتے ہیں کہ مغربی فکر و تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے والے منصوبے کی ناکامی اور اسلامی منصوبے کے لڑکھڑا جانے کو تسلیم کر لینے کے نتیجے میں از سر نو مراجعت، غور و فکر اور یہ جاننے کی کوشش کہ خلل کہاں ہے۔ ضروری ہو جاتی ہے اور شاید فکری بحران، تہذیبی فقدان، اور کلی و ہمہ گیر اسلامی نقطہ سے دیکھنے سے محرومی ہی کے اندر سب سے زیادہ صلاحیت ہے کہ نقص و خلل کے پس پردہ ان کے ہونے کو باور کر سکے اور اس بات کو تسلیم کرا سکے کہ اصلاح کا آغاز ان ہی سے ہونا چاہیئے۔ اس طرح اصلاح کے حلقے اپنا کارواں رواں دواں رکھ سکیں گے۔ تجربات کا جو انبار لگ چکا ہے ان سے استفادہ کر سکیں گے۔ ماضی میں جو روگ لگ گئے تھے ان سے بچ سکیں گے اور ان کو شرحِ صدر ہو جائے گا کہ فکری قضیے کی نزاکت اور اہمیت اس درجہ ہے کہ فکری قوت سے لیس مسلمانوں کی ایک جماعت کو خاص اس کام کے لئے نکلنا چاہیئے اور ایسے علمی ادارے قائم

ہونے چاہئیں جو ہیم اس کے لئے جد وجہد کریں، اس مسئلہ کو نکھارنے، اس کے تمام پہلوؤں کو روشن کرنے اور اس کے تمام اطراف کو سمیٹنے کے لئے اپنی ساری فکر مندیاں انڈیل دیں۔ اور معہد کو متوقع کردار انجام دینے کے لائق ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو مختلف سماجی علوم کی ماہر علمی شخصیتوں کا ایک اچھی ٹیم دستیاب ہوجائے، جنھیں متعلق شعبے میں مہارت ہو اور انھیں ایسے تجربات ہوں جن کی بناپر وہ اس بھاری بوجھ کو سنبھالنے کے قابل بن سکیں، اس طرح زیر بحث قضیہ کوئی انوکھا اور نیا قضیہ نہیں ہے بلکہ اس کی تاریخی بنیادیں ہیں اس کا آغاز اس وقت ہوگیا تھا جب اس کے مقدمات و علامات کا ظہور ہوا تھا اور ان کے تدارک اور علاج کے لئے کاوشیں شروع کی گئی تھیں۔

آج کا مطلوبہ قضیہ دراصل تجدید قضیہ ہے اور اُمت مسلمہ کے تمدن کی نشأۃ ثانیہ کا قضیہ ہے، انسانیت کے بچانے کا قضیہ ہے، تمدن کے احیاء کا قضیہ ہے، فکر کو صحیح سمت عطا کرنے کا قضیہ ہے۔ پستی میں گری ہوئی اس اُمت کو اوپر اٹھانے کا قضیہ ہے یہ کوئی نیا قضیہ نہیں ہے، یہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابوالحسن اشعری، امام غزالی، ابن حزم، ابن رشد، عز بن عبدالسلام، ابو شامہ، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ، ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم، شیخ محمد بن عبدالوہاب، امام شوکانی، شیخ ولی اللہ دہلوی، شیخ جمال الدین افغانی، شیخ محمد بن عبدہ، ڈاکٹر محمد اقبال، شیخ حسن البنا شہید، سید قطب شہید، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ابن بادیس، مالک بن بنی، نبہانی، اور اسلامی واصلاحی فکر کے ان تمام لوگوں کا قضیہ ہے جنھوں نے فکر اسلامی کی قیادت میں بھرپور حصہ لیا ہے، اس لئے بحران دور کرنے اور اُمت کی بیداری کے ضمن میں کسی بھی اسکیم پر غور کرتے وقت ان کی فکری کاوشوں کو ساتھ لینا اور ان کی تحریروں سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے، یہ قضیہ نیا کیوں کر ہوسکتا ہے؟ جبکہ ہر انسانی شئی کی طرح فکر ہی کے ساتھ فکر کے مسائل اور اس کی مشکلات کا ظہور بھی ہوتا ہے فکر کہیں خلاء سے وجود میں نہیں آتی اور نہ ہی وہ خلا کی سمت میں رُخ کرتی ہے بلکہ وہ آغاز وانتہا، وحی اور عقل، حقیقت اور مثال، زبان، زمان ومکان، انسان، حرکت اور تاریخ، حال ومستقبل، تقدیر وآزادی اور زندگی ان سب کی تاثیر، تاثر، اور لین دین کے نتیجے میں

فکر وجود میں آتی ہے۔ فکر سب سے پہلے مدرکاتِ عقل اور اقدارِ وحی الٰہی کی ہم آہنگی کا نام ہے پھر اقدار کو انسان کے موجودہ حالات پر منطبق کرنے اقدار کو زمانے کی وسعت کے مطابق پھیلانے اصول و مبادی کو پروگرام کی شکل دینے، اور اقدار کو ایسے افکار میں تبدیل کرنے کا نام ہے جو زمانے کی مشکلات کو دیکھیں اور اقدار کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنے پر قادر ہوں، انسانی اجتہادات اور کاوشوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہے۔ چنانچہ عقلی لغزش کی صلاحیت انسان کی بشریت اور اس کی عبودیت کا ایک مظہر ہے۔ غلطی کے اسباب متنوع ہیں جو معروف بھی ہیں اور مسلّم بھی، اسی طرح فکر انسانی پر طبعی، حسّی، تہذیبی اور انسانی تاثیر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔

یہیں سے اگلے فلاسفہ نے غور و فکر کے مناہج وضع کئے اور علم منطق کو وجود بخشا تاکہ غور و فکر میں ذہن ٹھوکر نہ کھائے اور تفکیر کے مرحلوں کی سلامتی واستقامت کی ضمانت مل جائے لیکن خود انسانی منطق حقائق کی تلاش وجستجو اور ایسے مقدمات کی رہنمائی میں جو صحیح نتائج تک پہنچانے والے ہوں اور زندگی و کائنات پر حکمراں نوامیس فطرت کو بے نقاب کرنے میں غلطی اور لغزش سے محفوظ نہ رہ سکی، عقل انسانی کو غلطی سے محفوظ رکھنے یا غلطی کی نسبت کم کرنے کی غرض سے متاخرین نے منطق کی تصحیح اور منہج کو صحیح سمت عطا کرنے کی کوشش کی کیونکہ غلطی کے پیش آنے کے امکانات پیہم ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہی نظریہ قائم کرنے والا ہے۔ وہی نظریہ کو تطبیق دینے والا ہے، وہی تطبیق کا وسیلہ اور ذریعہ اور وہی تحلیل وتجزیہ کا مادہ بھی ہے اسی لئے مسلم ذہن کی پیداور کو یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ عقلی معیار اور پیمانے بھی اسے دستیاب ہوتے ہیں اور وحی الٰہی کی جانب سے حفاظت کے سامان بھی، اس کے باوجود فکری بحران اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ یا تو وحی الٰہی کے اقدار کو ساتھ لینے اور حکیمانہ مناہج کے وضع کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی تا کہ ان حکیمانہ مناہج کو تسلسل کے ساتھ حالاتِ حاضرہ پر منطبق کیا جائے یا عقل کے اجتہادی کاوشوں سے رک جانے کے نتیجے میں فکری بحران پیدا ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے فکر کی بہت ساری غلطیوں، منطق کی (بکواس) اور مناہج کی لغزشوں کی جانب متنبہ کیا ہے اور گذشتہ امتوں کی بہت سی

فکری اور عملی بیماریوں کے بارے میں چوکنا کیا ہے جو بیماریاں ان امتوں کی ہلاکت و تباہی کا باعث بنیں۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

"فبما نقضہم میثاقہم لعناہم وجعلنا قلوبہم قاسیۃ یحرّفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظّا مما ذکروا بہ"۔ (سورۃ المائدۃ:۱۳)

"پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے، اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں لے جاتے ہیں جو تعلیم انھیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں"۔

اور فرمایا:

"وما اختلف الذین أوتوا الکتاب إلا من بعد ما جاءہم العلم بغیا بینہم"۔ (سورۃ آل عمران:۱۹)

"اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنھیں کتاب دی گئی تھی ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے ایسا کیا"۔

سورۃ آل عمران ہی میں ایک دوسری جگہ فرمایا:

ولا تکونوا کالذین تفرّقوا واختلفوا من بعد ما جاءہم البینات"۔ (آل عمران:۱۰۵)

"کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے"۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

ومن الذین ھادوا یحرّفون الکلم عن مواضعہ ویقولون

سمعنا وعصینا واسمع غیر مسمع وراعنا لیا بالسنتھم وطعناً فی الدین. (سورۃ النساء: ۴۶)

"جن لوگوں نے یہودیت کا طریقہ اختیار کیا، ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں اور دینِ حق کے خلاف نیش زنی کرنے کے لئے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں" اسمع غیر مسمع اور راعنا"۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

ولا تکونوا من المشرکین ○ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون ○ (سورۂ روم: ۳۱، ۳۲)

"اور نہ ہو جاؤ ان مشرکین میں سے جنھوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا اور گروہوں میں بٹ گئے ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے"

ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احتیاطیں برتیں اور بہت سی تدبیریں اختیار کیں جنھیں ہم پرہیزی کاروائیاں قرار دے سکتے ہیں تاکہ امت فکری بحران کے چنگل میں نہ پھنسے اور اس کے اسباب ومحرکات کا ارتکاب نہ کرے۔ چنانچہ جس وقت بعض صحابہ کے نزدیک تقدیر کے مفہوم اور انسان کے اپنے فعل کی ذمہ داری کے مفہوم اور فعل کو انجام دینے میں انسان کی آزادی اور اس انجام دہی میں انسان کے اختیار کے درمیان اشتباہ پیدا ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسلوب وطریقہ کار پر شدت سے نکیر فرمائی اور لوگوں کو چوکنا کیا جس کی بنا پر مسئلہ اس طرح سامنے آیا، اسی طرح عالم غیب اور عالم شہادت کے معاملوں کے درمیان جن لوگوں نے خلط ملط اس طرح کیا تھا کہ انسان کو بے عمل بنا دے، ایمان بالغیب کی فاعلیت ختم کر دے اور عالم شہادت پر ایمان بالغیب کی مثبت تاثیر کو زائل کر دے، اسی طرح اس کے نتیجے میں مسلمان اپنی تکریم، اور اپنے عمل میں آزادی اختیار کر کے احساس سے محروم اور اپنی ذمہ داری کے احساس سے عاری ہو جاتا ہے جو دراصل اس کی آزادی کا ثمرہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس خلط ملط کے نتیجے میں عاجز ہو جاتا ہے اور ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے، اس طرح

وہ مرجع و ماخذ کے صحیح دائرے کی تعیین سے قاصر ہوتا ہے، بالآخر وہ اپنے عمل کو پرکھنے، اس پر نظر ثانی کرنے اور اپنے اعمال کو صحیح سمت عطا کرنے سے معذور ہو کر رہ جاتا ہے۔ الغرض رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم غیب اور عالم شہادت کے مسئلہ کو اس طرح خلط ملط کرنے پر شدید نکیر فرمائی، احادیث صحیحہ کے مجموعے سے یہ بات جھلکتی ہے جس میں تقدیر کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ ایک صحابی نے تقدیر پہ تقدیر ہی کے ذریعہ غالب آنے کی بات کہی ہے۔ ایک دوسرے صحابی نے تقدیر سے بھاگ کر تقدیر ہی کی پناہ میں آنے کی بات کہی ہے، بالفاظ دیگر تقدیر انسان کے مختار ہونے کی آزادی کو سلب نہیں کرتی ہے بلکہ اس کے ارادے کو مضبوط کرتی ہے اور نتیجہ کے طور پر اس کی ذمہ داری کو بڑھا دیتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے توکل کو اسباب چھوڑنے کا مترادف سمجھا تو آپؐ نے اس غلط خیال کی تصحیح فرمائی کہ اسباب کا اختیار کرنا توکل ہی کا ایک جزء ہے۔ بلکہ بعینہ یہی توکل ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنی اونٹنی کو بیڑی لگائے بغیر یونہی چھوڑ دیا اور اسے توکل سمجھا تو آپؐ نے اس سے فرمایا "اعقلها وتوکل" کہ پہلے اپنی اونٹنی کو بیڑی پہنا دو پھر توکل کرو۔[1]

ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا:

> لو توکلتم علی اللّٰہ حق توکله لرزقکم کما یرزق الطیر، تغدو خماصًا وتروح بطانًا۔[2]
>
> "اگر تم لوگ اللہ پر توکل کرتے جیسا اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تم کو روزی دیتا جس طرح پرندوں کو روزی دیتا ہے۔ پرندے صبح کو نکلتے ہیں تو بھوکے پیٹ ہوتے ہیں لیکن جب شام کو واپس آتے ہیں تو شکم سیر ہوتے ہیں۔"

پرندے غیر مکلف مخلوق ہیں اس کے باوجود صبح و شام روزی کی تلاش میں ان کا نکلنا بند نہیں ہوتا تو انسان کو جو خلافت کے منصب پر فائز ہے اسے دوسروں پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنے کی

---

[1] پوری حدیث ترمذی میں حضرت انسؓ سے مروی ہے۔

[2] مسند احمد بن حنبل میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے۔

اجازت کیسے دی جا سکتی ہے۔

جب بعض لوگوں نے عبادت کا مفہوم دنیاوی کاموں کو چھوڑ کر صرف فرائض و نوافل کی ادائیگی تک محدود سمجھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط مفہوم کی تصحیح فرمائی اور ایمان کا ہمہ گیر تمدنی مفہوم بیان فرمایا:

"الایمان بضع وسبعون شعبة أعلاها شهادة أن لا إله الا الله وأدناها إماطة الأذى عن الطريق[1]"

"ایمان کے کچھ اوپر ستر شعبے ہیں سب سے اعلیٰ لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے اور سب سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے"۔

آپ نے عبادت کا مکمل صحیح دائرہ متعین فرما دیا چنانچہ آپ نے فرمایا:

أما والله إني لأعبدكم لله وأتقاكم له: إني لأصلي وأنام، وأصوم وأفطر، وأتزوج النساء، فمن رغب عن سنتي فليس مني[2]۔

"سن لو بخدا میں تم میں سب سے زیادہ اللہ کی عبادت کرنے والا ہوں۔ اور تم میں سب سے زیادہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں۔ اس کے باوجود میں نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ روزہ بھی رکھتا ہوں اور کبھی روزہ نہیں بھی رکھتا ہوں۔ اور عورتوں سے شادیاں بھی کرتا ہوں۔ تو جو شخص میرے طریقے سے گریز کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا"۔

انسان کی تربیتی و تہذیبی تعمیر میں زمانی و مکانی وسعتوں کی اہمیت واضح کرنے، نصوص شرعیہ کے اندر مقصد و غایت پر نظر رکھنے، بعض احکام میں تخصیص اور بعض دوسرے احکام میں اطلاق و عموم کی رعایت کرنے کے ضمن میں آپ نے بہت سے مسائل کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] امام ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔

[2] امام مسلم نے حضرت انسؓ سے باب النکاح میں یہ حدیث روایت کی ہے۔

"کنت قد نہیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانہا تذکر الآخرۃ"[1]

"میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے روکا تھا۔ اب تم قبروں کی زیارت کر سکتے ہو کیونکہ قبریں آخرت کو یاد دلاتی ہیں۔"

ایک دوسرے موقعہ پر آپ نے ارشاد فرمایا:

"ولولا أن قومک حدیثو عہد بکفر لہدمت الکعبۃ وبنیتہا علی قواعد اسماعیل"[2]

"اے عائشہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تیری قوم حال ہی میں اسلام میں داخل ہوئی ہے تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اس کی تعمیر حضرت اسماعیل کی بنیادوں پر کرتا۔"

○ دعوت کے مختلف مراحل میں بالخصوص تربیت کے اولین دور میں ماخذ اور منہج کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ ماخذ کے دائرے کو ذہنوں میں جاگزیں کرنے کے واسطے حضرت عمر فاروق کا تورات کا ایک صفحہ لیکر پڑھنے کو ناپسند فرمایا، آپ نے فرمایا:

"أکتاب مع کتاب اللہ وأنا بین أظہرکم، لو کان أخی موسی حیا لما وسعہ الا اتباعی"[3]

"کیا تمہارے درمیان میری موجودگی ہی میں اللہ کی کتاب (قرآن) کے ساتھ کوئی دوسری کتاب پڑھی جائے گی۔ اگر اس وقت میرے بھائی موسیٰ بھی حیات ہوتے تو ان کے لئے میری پیروی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔"

آپؐ نے نقل کے منہج، اس کے اصول وقواعد اور اس کے وسائل کی بنیاد رکھی اور بایں طور کہ آپ نے قرآن کے حفظ اور اس کی تدوین کا حکم فرمایا، خود اپنے لئے چند کاتب

---

[1] امام بخاری، امام مسلم اور امام نسائی نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے۔

[2] " " " " " " "

[3] امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔

تعین فرمائے جو آپ کے لئے قرآن پاک کی آیتیں لکھتے تھے۔ ہر آیت کو اس مقام پر رکھتے جہاں آپؐ حکم فرماتے، قرآن کی تدوین کے ساتھ سنت کی تدوین سے آپؐ نے منع فرمایا تاکہ کسی چیز میں ذرا بھی اشتباہ نہ ہو۔ اس لئے بھی کہ لوگ قرآن کے شرح و بیان (حدیث) لکھنے میں مشغول ہو کر کہیں قرآن لکھنا ہی نہ چھوڑ دیں چنانچہ آپؐ نے فرمایا:

"لا تکتبوا عنی غیر القرآن، ومن کتب عنی شیئاً غیر القرآن فلیمحہ[1]"

"مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو، اگر کسی نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہے تو اسے مٹا دے۔"

مسلمانوں کے اندر تمدنی حس کی تعمیر و تربیت کے دائرے میں اور مقصد نبوت جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

"وما أرسلنٰک الا رحمۃ للعالمین۔"

"اے نبی ہم نے تم کو سارے جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

کے دائرے میں یہ حدیث لکھی جا سکتی ہے:

"دخلت امرأۃ النار فی ھرۃ حبستھا فلا ھی اطعمتھا ولا ھی ترکتھا تأکل من خشاش الأرض[2]۔"

"ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے جس کو اس نے بند کر رکھا تھا جہنم میں جائے گی نہ تو اسے کھلایا نہ ہی اس کو آزاد کیا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑوں کو کھاتی۔"

اسی ضمن میں یہ حدیث بھی آتی ہے: أحد جبل یحبنا ونحبہ[3]۔

"احد ایک پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔"

اسی سلسلے میں اونٹنی اور اس کے رونے والی حدیث اور کبوتر والی حدیث اور اس طرح کی دیگر حدیثیں آتی ہیں۔

---

[1] امام مسلم نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے۔

[2] امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔

[3] امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔

○ حریتِ عمل اور اجتہاد پر آدمی کو قادر بنانے کی غرض سے مباح کے دائرے کو وسیع کرنے کی اہمیت واضح کرنے کے لئے کثرتِ سوال، بال کی کھال نکالنے اور قیل وقال سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے اختلاف وتفرقہ بڑھتا ہے اور مباحات کا دائرہ تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔

رائے پیش کرنے اور اجتہاد کے دائرے کو وسیع تر کرنے کی غرض سے آپؐ نے اپنے ہوتے ہوئے اجتہاد کا حکم فرمایا اور صحابہ کرام میں سے جو لوگ اجتہاد کی صلاحیت رکھتے تھے ان کی تربیت فرمائی، چنانچہ اختلاف وفتن سے چوکنا رہنے کے ضمن میں اور دوسری قوموں کے انجام کے بیان میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان کو اسی دائرے میں سمجھنا چاہیئے۔

جہاں تک فقہی دائرے یا احکام سے متعلق احادیث کا معاملہ ہے تو احکام کی آیات ہی کی طرح قلیل ہیں۔ ہمارے علم کے مطابق ایسی حدیثوں کی کم سے کم تعداد ۲۴۰ اور زیادہ سے زیادہ گیارہ سو بتائی جاتی ہے۔ صحابہ کرام کے نزدیک قولی اور عملی سنتیں فکری منہج کی اصول سازی کا کام دیتی تھیں۔ جس وقت تقدیر کے مسئلے کو سمجھنے میں غلطیوں کے نمونے سامنے آنے لگے تو یہ حضرت عمر فاروق کا زمانہ تھا۔ انھوں نے وضاحت کے ساتھ مسئلے کو فوراً بیان کرکے اس کے سدباب کی سعی کی، چنانچہ تقدیر کے مسئلے میں انحراف پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

"إن فلانا - أى ابن أبى الاصبغ - ضيّع ما ولّى وتولّى ما كفى"۔ بلاشبہ ابن ابی الاصبغ جس کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اس کو ضائع کردیا اور جو چیز کافی تھی اس کی ذمہ داری قبول کرلی تاکہ تکفیر کے مواقع اور اس کے میدانوں کے درمیان خط فاصل واضح کردیں۔

ارتداد اور اس کا حل نکالنے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو موقف اختیار کیا اس سے صحابہ کرام کا موقف متعین کیا جاسکتا ہے اور سمجھا جاسکتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی مزاج نظام کے تقاضے اور اس کے مختلف پہلوؤں کے درمیان جو ربط وتعلق ہے اس کا کس درجہ فہم وشعور حضرت ابوبکر کو حاصل تھا۔ اگر ان میں سے کسی حلقے میں بھی فہم درست نہ رہے تو سب کے لئے خطرہ پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد کچھ عرصہ نہ گذرا ہو، اگر ان کے نزدیک نبوت اور خلافت کے ادوار کو سمجھنے میں لغزش ہوجائے، اور مالی فرائض اور جسمانی فرائض کے درمیان تفریق کی جانے لگے تو اس کے معنی جماعت کے

خلاف بغاوت کرنے اور نوزائیدہ اُمت کی بنیاد کو مسمار کرنے کے ہیں اور امت کے متوقع تمدنی وجود کے کردار کی بیخ کنی کے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس موقف کو یکسر ٹھکرا دیا اور عرب کے بدوی قبائل نے اپنے موقف کے استدلال میں جو جواز پیش کیا ان کی جانب مطلق دھیان نہ دیا کیونکہ وقتی سیاسی فائدے کے مقابلے میں منبع کے لئے بنیاد و جڑ فراہم کرنا مقدم ہے۔ اور جزئی علاج سے مسئلہ حل ہونے کے بجائے اور گمبھیر ہو جاتا ہے۔ ماخذ کی اہمیت کے ادراک کے سلسلے میں بھی ان کا فکری موقف بڑا شاندار رہا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ادنیٰ تغیر و تبدل کے بغیر بعینہ اسی صورت میں جو نزول وحی کے وقت تھا قرآن کی حفاظت مطلوب ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام نے قرآن کے حفظ و کتابت دونوں میں عجلت سے کام لیا پھر قرآن کے جمع و تدوین میں تاخیر نہیں کی، اس کے برعکس سنت کی حیثیت شرح و بیان کی تھی اس کا بھی امکان تھا کہ بعینہ ان ہی الفاظ میں روایت کی جا رہی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے۔ وہیں یہ بھی امکان ہے کہ راوی حضورؐ کے بیان کردہ مفہوم کو اپنی زبان میں اور اپنے الفاظ میں نقل کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع میں سنت کی تدوین کی عمومی دعوت نہیں دی گئی اس لئے کہ اس وقت سب سے اولین بنیاد اور مرجع کے حفظ و حفاظت کے کاموں میں لوگ منہمک تھے۔ بلکہ روایت کرنے اور روایت کو قبول کرنے میں اول اول شدت پسندی کا رویہ رہا، بعض اوقات کثرتِ روایت سے روکا گیا تاکہ حدیث کی روایت کی کثرت قرآن کے ساتھ انہماک کو کمزور نہ کر ڈالے جس کے نتیجے میں قرآنی آیات پر غور و تدبر اور اس کے سمجھنے کی صلاحیت کمزور پڑ جائے کثرتِ روایت سے روکنے میں یہ مصلحت بھی کارفرما تھی کہ لوگ روایات ہی پر تکیہ کر کے قرآن سے بے نیاز نہ ہو جائیں اور وہ افسوسناک صورتِ حال پیش آئے جو بعد کی صدیوں میں پیش آئی، شروع میں یہ ہوا کہ لوگ احادیث میں اشتغال کے سبب قرآن سے بے پرواہ ہوئے پھر فقہ سے انہماک اس درجہ ہوا کہ سنن سے لاپرواہی برتی جانے لگی، اس کے بعد قدماء کی فقہ کی شرحوں اور متون سے اشتغال کا زمانہ آیا جس کی وجہ سے کتاب و سنت اور خود قدماء کی فقہ دبیز گردمیں چھپ کر رہ گئی، خلاصہ یہ کہ صحابہ کرام کے

نزدیک معاملہ واضح اور اس کا راستہ روشن تھا۔ چنانچہ رسالت کو تحریف، تغیر اور غلط تاویل سے بچانے میں صحابہ کرام کے فہم و موقف نے دور رس اثر ڈالا، اور اسلام کے اولین سرچشمے ہر زمانے میں عطاو دہش پر قادر رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت دنیا سے تشریف لے گئے اس وقت صورت حال یہ تھی کہ دین کی تکمیل ہو چکی تھی نعمت الٰہی پوری ہو چکی تھی۔ ذہن مسلم کے لئے راہ سیدھی ہو چکی تھی شاہراہ روشن ہو چکی تھی۔ منہج سلیم الگ ہو چکا تھا۔ منطق درست ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر حجت تمام ہو چکی تھی اور انسان اپنی پوری ذمہ داریوں اور کامل صلاحیتوں کے ساتھ اس پوزیشن میں کھڑا تھا کہ:

"من اھتدیٰ فانما یہتدی لنفسہ ومن ضلّ فانما یضلّ علیہا"[1]

"جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے"۔

"إن أحسنتم أحسنتم لأنفسکم وإن اسأتم فلہا"[2]

"تم بھلائی کرو گے تو اپنے ہی لئے بھلائی کرو گے، اور اگر برائی کرو گے تو وہ اپنی ہی ذات کے لئے برائی ہوگی"۔

اسی طرح آپؐ نے بعد کے لئے تجدید و اصلاح کے کاموں کے واسطے قواعد و ضوابط کی بنیادیں فراہم کیں تاکہ جب بھی وقفہ طویل ہو جائے، دل سخت ہو جائیں، فہم و فقہ میں کمی آجائے، فکر انتشار کا شکار ہو جائے، اور اسلام سے روابط کی کڑیاں ٹوٹنے لگیں تو امت کے برگزیدہ اور دانش ور افراد دوبارہ اُمت کو شاہراہِ حق پر لے آئیں اور ان کی ضرورتوں پر لبیک کہہ سکیں تاکہ یہ اُمت اپنے تمدنی وجود کی حفاظت کر سکے، اور قوموں کے درمیان اپنی معتدلانہ حیثیت برقرار رکھ سکے، اس لئے بھی تاکہ اس کا دین تمام ادیان پر غالب آسکے، اس کی شریعت اپنی ہمہ گیری اور آفاقیت کو دوام بخش سکے، اور ہر زمانے اور ہر جگہ انسانیت کی حاجتوں کی تکمیل پر قادر رہ سکے۔

---

[1] سورۃ اسراء: ۱۵ [2] سورۃ اسراء: ۷

اس دائرے میں بھی امامت، جہاد، وحدتِ امت، عمومی خطائے سے اس کی عصمت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضابطے، وقف اور ثواب کے دوسرے کاموں کے احکام سمجھے جاسکتے ہیں۔ ان تمام قواعد وارکان میں تجدید کا مقصد واضح نظر آتا ہے۔ اور عقلی بحرانوں اور فکری تعطل سے احتیاط آشکارا نظر آتی ہے۔ اس لئے فکری بحران کا حل تلاش کرنے کی دعوت کو نئی دعوت قرار دینا، یا اس بحران کے تاریخی وجود کا انکار یا اس کی سنگینی کو کم کرنا یا اس دعوت کے حاملین کو موجودہ زمانے کی پیداوار قرار دینا جن کا ماضی سے کسی قسم کا ربطہ نہ ہو، یہ ساری ہی باتیں اس اُمت کی خصوصیت سے متعارض ہیں صحیح سمت عطا کرنا۔ اصلاح وتجدید اور بحرانوں کا حل ڈھونڈنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب قرار دینا، تمدنی زوال اور امت کی تبدیلی کے الٰہی قانون کا نشانہ بننے سے چوکنا رہنا یہ ساری ہی چیزیں اس امر کی دلیل ہیں کہ امت کا فکری بحران سے دوچار ہونے کا امکان اور جواز ہے۔ خواہ نبوت کے زمانے سے وقفہ طویل ہونے اور دلوں کی سختی کے سبب ہو یا گذشتہ یا بعد میں آنے والی گمراہ قوموں کی راہ اپنانے کی وجہ سے ہو، یا اس کا سبب فہم ومطالعہ کے مناہج کا اضطراب وانتشار ہو یا "تدافع" کا قانون اختیار کرنے سے پہلوتہی ہو، یا مجموعی طور سے مذکورہ بالا سارے ہی اسباب اثر انداز ہوں بلکہ ان کے ساتھ کچھ دوسرے اسباب بھی مل گئے ہوں۔

اسی طرح نبوت کے زمانے میں قرآن وسنت کے ساتھ اہتمام ہمارے دعویٰ کی دوسری دلیل ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عین اس وقت جب اسلامی تعمیر وتاسیس کی کاروائیاں بلندیوں پر فائز تھیں۔ بحران کے بہت سے عوامل اس کے مظاہر اور اس میں گرفتار ہونے کی علامات ان سے شفایاب ہونے کے طریقے اور ان کی گرفت سے نجات حاصل کرنے کے ذرائع سے متنبہ اور باخبر کیا گیا، خواہ قرآنی قصص کے ذریعے ہو یا قرآنی امثال کے ذریعہ احادیث فتن اور علامات قیامت کے بیان کے ذریعہ ہو یا آبادی کی ویرانی اور اس کے محرکات

کا ذکر کرے، تاکہ مختلف حالات کے لحاظ سے جو الٰہی قوانین ہیں مسلم ذہن کو ان کا پورا ادراک وشعور رہنا چاہیے، چنانچہ ان قوانینِ فطرت میں سے کسی قانون کے تحت امت کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو قانونِ شفا کا نسخہ استعمال کر کے اس مرض یا مصیبت کا سامنا کر سکتی ہے جیسے بیماریوں کا ازالہ دواؤں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

تحریک کی فکر
یا
فکر کی تحریک

اُمت کی تحریک کے واسطے لازمی فکری اور منہاجی بنیادوں کو تیار کرنے اور اُمت کے سامنے پیش کرنے کے کام میں شرکت ہمارے خیال میں ایک ایسی امانت ہے جس کے بار کو اٹھانا اور اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ یعنی ہم کدو کاوش اور محنت و جانفشانی کرتے رہیں، سعی وعمل کا سلسلہ جاری رکھیں، تاکہ اس معاصر فکری اسلامی نظام کو اچھی طرح نکھار ڈالیں جو مغربی نظام کے بدل کے طور پر تیار کیا گیا ہے۔ اور جس کے ذریعہ ہم زندگی انسان اور کائنات کے واسطے صحیح اسلامی تصوّر کے مطابق مسلم ذہن کی تعمیر وتشکیل کر سکتے ہیں۔ دراصل وہ توحید پر مبنی صحیح اسلامی تصوّر ہے جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہے۔ اور جو نوامیس کائنات اور قوانین وجود میں غور وفکر کرتا ہے۔ ان قوانین پر تدبر کے نتیجے میں انسان تسخیر کائنات کے لائق بنتا ہے اور اقتدار واستخلاف کی شرائط فراہم کرتا ہے۔ یہی وہ تصوّر ہے جو تخلیق کے مقاصد کا ادراک کرنے والا، انسانی زمانی اور مکانی فاصلوں نیز وحدتِ حق، وحدتِ حقیقت، اور وحدت خلق کا شعور رکھنے والا ہے۔ اور اس تصوّر کے ذریعہ ہم امت کی تحریک کو اس فکری توشہ سے غذا فراہم کر سکتے ہیں جو فکری توشہ اُمت کو مطلوب ہے اور جس کی امت ضرورت مند بھی ہے۔

اسی کے ساتھ نزول وحی کے وقت سے لیکر اب تک کی فکر اسلامی کی تحریک کا تاریخی حیثیت سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ جس میں صحیح علمی تجزیہ ہو اور جس کے ذریعہ اس فکر کی رفتار دسفر کا پورے طور پر ہمیں علم وواقفیت ہو سکے اس تجزیہ کے

ذریعہ یہ بھی پتہ چلے کہ کون کون سے عناصر اس کی تکوین میں کار فرما رہے ہیں. کون کون سے اسباب اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح مثبت اور منفی اثرات کیا مرتب ہوئے ہیں اس کے تجزیہ میں یہ بھی کھوج لگائی گئی ہو کہ اس کی تکوین اور تشکیل کے طریقے کیا ہیں۔ الغرض جس طرح کھرے کھوٹے سکے پرکھتے وقت صرّاف بے لاگ فیصلہ کرتے ہیں اسی طرح اس فکر کے بارے میں بے لاگ فیصلہ کیا جائے اس لئے کہ انسان کے موجودہ حالات پر اقدار کو منطبق کرنے کے ضمن میں یہ ایک انسانی اجتہاد ہے جس میں خطا وصواب دونوں کا احتمال ہے اور چونکہ اس وقت لوگوں کے جو حالات تھے ان حالات پر لبیک کہتے ہوئے یہ اجتہاد کیا گیا ہے اس لئے اس کا تقاضا ہے کہ زمانے کی ضروریات کے مطابق اصلاح و تبدیلی کے لئے اجتہاد کا عمل مسلسل جاری رہے، اسی طرح اس کے مطالعہ کا کام متواتر جاری رہنا چاہیئے تاکہ اس سے استفادہ کیا جاسکے اس کے ذریعہ نقطۂ نظر کو مالا مال کیا جاسکے اور آئندہ کے عمل کی بنیاد اس پر استوار کیا جاسکے اسی طرح اس کے منفی پہلوؤں اور ان بیماریوں سے بچا جاسکے جو بیماریاں فکر اسلامی کو لاحق ہوئیں، استشراقی، جزئی، گروہ بندی یا فرقہ واریت کی عینک لگا کر جو مطالعے ہوئے ہیں اور اس کے جو ناروا اثرات مرتب ہوئے ہیں ان سب سے بچنے کے لئے فکری اجتہاد ناگزیر اور ضروری ہے اس لئے کہ اس نوع کے مطالعے عام طور سے یک رخی ہوتے ہیں یا ناقص ہوتے ہیں ان کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ پہلے سے طے شدہ یا فرض کردہ کسی چیز کو دریافت کیا جائے یا ماضی میں پیش آمدہ کسی چیز کے لئے دلیل یا تائید فراہم کیا جائے، معروضیت اور علمی پہلو دونوں اس قسم کے مطالعے میں مفقود ہوتے ہیں۔ وسعت و ہمہ گیری کا بھی فقدان ہوتا ہے یوں اس مطالعے کے بیشتر فوائد رائیگاں چلے جاتے ہیں اگرچہ یہ خدائی وعدہ ہے کہ پوری امت گمراہی پر اکٹھی نہیں ہوگی یہ وعدہ پورے طور پر اُمت کے انحراف کی راہ میں حائل ہوجاتا ہے اور اسی خدائی وعدہ کی بدولت مجموعی طور سے اُمت میں تمدنی امکان اور اس کے سواد اعظم میں بیداری قبول کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اس لئے ہمارے نزدیک ایسے خصوصی اداروں کا قیام بہت ضروری ہے جو امت کے فکری بحران کے تدارک وازالہ کو اپنی سرگرمیوں کا محور اور اپنے مقاصد کا مرکز بنائیں، اس طور پر کہ امت کی تحریک کو جس فکری تیاری کی ضرورت ہے اس مہم کو اور اسلام کے میدان میں فکری قیادت کی تشکیل کے کام کو چھوڑ کر کوئی اور کام نہ کریں، اس لئے کہ ہر زمانے میں یہی مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ مسلم ذہن کس حد تک ایسے حسی افکار کو وجود میں لا سکتا ہے جو امت کو متحرک اور سرگرم بنانے والے ہوں، جو امت کو اقدار سے جوڑنے والے ہوں جو کتاب وسنت کے سلسلے میں امت کی رہنمائی کرنے والے ہوں اور جو صرف فقہ تشریعی ہی کے میدان میں نہیں بلکہ زندگی کے مختلف میدانوں میں ان اقدار کو اپنے ہم رکاب رکھنے والے ہوں مسلسل ہم جس مسئلہ اور جس پریشانی سے دوچار ہیں وہ اقدار کا بحران نہیں ہے یا اقدار کے تصور، یا اقدار کی اہمیت کی معرفت وواقفیت کا بحران نہیں ہے۔ اس لئے کہ جہاں تک اقدار کا تعلق ہے تو وہ کتاب وسنت کے خزانے میں محفوظ ہیں۔ بحران دراصل فکری ہے یعنی ایسے فکر کو وجود میں لانا جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اس میں زمان ومکان اور انسان کی بھی رعایت کی گئی ہو ایسا فکر جو ان اقدار کو حالات حاضرہ پر منطبق کرنے کے کام کو اچھی طرح انجام دے سکتا ہو۔ ایسا فکر جو حالات حاضرہ پر منطبق کرنے کا منہج بنا سکتا ہو اور تجدید کے جاری منہج کے ساتھ اس منہج کی نگہداشت کرنے والا ہو، نوامیس فطرت کا مسلسل شعور رکھنے والا ہو، ایسے افکار ہم کیسے وجود میں لائیں اور ان افکار کو زندگی بخش افکار میں کیسے تبدیل کریں جو زمانے کی ضرورتوں اور زمانے کی عطا کردہ سہولتوں کی روشنی میں ہماری امت کی تحریک کو منضبط کر سکے؟

اُصول و مبادیٔ
اور
لائحہ عمل

"اسلامیۃ المعرفۃ" (علم و آگہی کو اسلامی بنانا) نامی کتاب کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب اپنی روح اور اصل کے اعتبار سے عمومی اصول و مبادی، عملی پروگرام، تحریک و فکر کے رخ کے بیان کی اولین کوشش ہے جس کو معہد نے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

یہ دراصل ایک اجتہادی کاوش ہے جس کا آغاز ایک نظریہ کی صورت میں ہوا، ۱۹۸۴ء سے ان کے بعض پہلوؤں پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ قرآن اور سنت کے ساتھ ردیہ و موقف کی کیفیت کے سلسلے میں کچھ تحریری کاوشیں سامنے آئی ہیں۔ مزید برآں قدیم علمی ذخیروں کی نشر و اشاعت اور ان سے استفادہ کو سہل بنانے نیز مغربی افکار اور ان کی آگہی کے میدان میں بھی خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ ان کاوشوں کے حجم و معیار سے صرف نظر کر کے ان کو پیش کرنا، ان کا مطالعہ کرنا، اور ان کو راہِ صحیح رُخ دینا بجائے خود ایک ضروری کام ہے تاکہ ہمیں پتہ چل سکے کہ کس حد تک پروگرام درست ہے اور ہماری تمناؤں و آرزوں کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے والا ہے نیز، اغراض و مقاصد کو بروئے کار لانے کے اعتبار سے مکمل ہے اگر کہیں نقص ہے تو اسے دور کر کے کیونکر کامل بنایا جا سکتا ہے؟ تجویز کردہ بیشتر وسائل زیر عمل آ چکے ہیں جیسے سیمینار، بحث و مناقشے کے حلقے، انفرادی اور اجتماعی ریسرچ و تحقیق کے منصوبے اور تحقیقی کاوشوں کی اشاعت وغیرہ ان کاموں کو بھی صحیح سمت عطا کرنے، ان کا جائزہ لینے اور ان کے نتائج کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔

ضرورت تھی کہ بہت سی جگہوں پر معہد اپنے دفاتر اور برانچ کھولے جو ایک طرف وہاں کے

حالات معلوم کرنے کا ذریعہ نہیں تو دوسری طرف معہد اپنا پیغام ان کے ذریعہ پیش کر سکے اور دوسروں تک پہنچا سکے، اس طرح معہد ان علاقوں میں اپنے دفاتر اور برانچز کے توسط سے اپنا فریضہ ادا کرنے پر قادر ہو سکے، اب تک جو کوششیں ہوئی ہیں ان میں سے بعض کے اچھے نتائج سامنے آئے ہیں جبکہ بعض کوششوں کے متوقع نتائج برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ بہر حال ابھی یہ ضرورت ختم نہیں ہوئی ہے کہ ان برانچوں اور دفاتر کی افادیت کا جائزہ لیا جاتا رہے، راہِ راست کی رہنمائی کی جاتی رہے اور بہتر سے بہتر ڈھنگ سے کام کرنے کے واسطے صحیح پلاننگ کا سلسلہ جاری رہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ دیگر کاموں کی طرح اس کام میں بھی کچھ چیزیں بنیادی امور کا درجہ رکھتی ہیں اور کچھ مقاصد کا، کچھ کام کے واسطے وسائل و ذرائع کا کچھ کام کے قواعد و ضوابط اور فکری منصوبہ بندی کا مقام حاصل ہوتا ہے ان امور کی تجدید، تصحیح، نظر ثانی اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کی بھی ضرورت ہے۔

فکری سفر کے ذکر کے بعد جس کا آغاز اس منصوبہ کے اولین قائدین کے ہمراہ ہوا تھا جن میں سر فہرست برادر پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید احمد ابو سلیمان اور اسماعیل فاروقی شہید تھے۔ پھر وہ تمام لوگ جو اس مبارک قافلے سے آملے، ہم زیر بحث منصوبہ کا خلاصہ اور نچوڑ بنیادی امور اغراض و مقاصد، وسائل، شرائط اور عملی اقدام کی تقسیم کے ذریعہ مندرجہ ذیل صورتوں میں منصوبہ پیش کر سکتے ہیں۔

① بنیادی امور:

- اس پر ایمان کہ اسلام کا پیغام ایک عالمگیر اور ابدی پیغام ہے۔ اس پیغام کا مخاطب ہر جگہ اور ہر زمانے کا انسان ہے۔
- اس پر ایمان کہ اسلام کا پیغام ابدی اور آخری ہے۔ جو زمان و مکان کی حدود کا پابند نہیں ہے۔
- اس پر یقین کہ امت کا بحران دراصل فکری بحران ہے۔ اقدار کا بحران نہیں ہے۔ کیونکہ اقدار کتاب و سنت کے اندر محفوظ ہیں اور خود اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری

قبول کی ہے۔

- اس پر ایمان کہ اقدار کی رہنمائیوں کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق فکر سازی کرنے، خلافت کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے نوامیسِ فطرت کو زیر تصرف لانے، اور امامت وانسانیت کی مشکلات کو حل کرنے اور پریشانیوں سے نجات دلانے پر امت پوری طرح قادر ہے۔
- اس پر ایمان کہ تحریک کا بدل افکار نہیں ہو سکتے، لیکن تحریک کو راہِ راست پر گامزن رکھنے کیلئے افکار شرط کا درجہ رکھتے ہیں۔ نیز عمل وکردار کی صحت فکری بنیادوں کی سلامتی کے ساتھ وابستہ ہے۔
- اس پر یقین کہ امت کا سوادِ اعظم ارتداد اور عمومی گمراہی سے محفوظ رہے گا۔ نیز تمدنی ترقی کے وسائل کو زیرِ تصرف لانے کی امت کے اندر پوری صلاحیت ہے۔ بشرطیکہ تمدنی ترقی کی شرطیں پوری ہوں اور قوانین فطرت پر اسے دسترس حاصل ہو۔

② ترجیحات:

- قرآن وسنت کا از سرِ نو اس اعتبار سے مطالعہ کہ وہ دونوں، فکر، علم وآگہی اور تہذیب وتمدن کا سرچشمہ اور منبع ہیں۔ سیرت صحیحہ کو بطور اسوہ اختیار کرنا کہ یہ وحی الٰہی کی نگرانی کی وجہ سے محفوظ رہا ہے تاکہ نصوص کو حالاتِ حاضرہ پر منطبق کرتے وقت سیرت سے رہنمائی حاصل کی جا سکے۔
- اسلامی تہذیب وتمدن کے موضوع سے متعلق قدیم علمی ذخیروں کا از سرِ نو مطالعہ اور اسلامی اغراض ومقاصد کے معیاروں کے انہیں تابع بنانا۔
- تہذیب، تمدن اور علمی تبادلے کے میدان میں جو انسانی کاوشیں سامنے آئی ہیں ان کے پس منظر اور ان کے مراجع کو سامنے رکھتے ہوئے ہوشیاری کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا۔
- موجودہ اسلامی حالات کا جائزہ، اس کی ضروریات کو سمجھنا، دنیائے اسلام

جن مصائب و پریشانیوں سے دوچار ہے ان کے اسباب کی تعیین۔
مذکورہ بالا مطالعوں اور جائزوں کی روشنی میں اسلام کے مستقبل کے افقوں کو دیکھنا اور اس کو بروئے کار لانے کی غرض سے امت کے اندر حرکت و نشاط پیدا کرنا اور اس کے لئے سرگرم عمل ہونا۔

(۳) نصب العین:

ایسے روشن خیال مسلم ذہن کی دوبارہ تشکیل جو اپنا پیغام دوسروں تک پہنچائے۔ اجتہاد، تجدید، اور انسانی آبادکاری میں اپنا کردار انجام دینے پر پوری طرح قادر ہوں۔ نیز مسلمانوں کو خلافت کا رول ادا کرنے کے لائق بنانا اور تسخیر کائنات کی صلاحیت پیدا کرنا اس مقصد کے حصول کے لئے تہذیبی اور فکری دوروں کا اہتمام کرنا، انفس و آفاق میں جو الٰہی قوانین کارفرما ہیں ان کو بے نقاب کرنا تاکہ ان کے ذریعہ تسخیر کائنات کے وسائل پر دسترس حاصل ہو۔

اس نصب العین کے حصول کے دو راستے ہیں:

(۱) عالم افکار کی تطہیر اور صفائی، تہذیبی ورثہ کا از سر نو مطالعہ کرنا، درایت اور تمدنی سوجھ بوجھ پر مبنی زاویۂ نگاہ سے اس ثقافتی سرمایہ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا۔

(۲) اسلام کے تہذیبی اور تعلیمی نظام کی تشکیل۔

مذکورہ بالا دونوں راستوں پر گامزن ہونے کے لئے چند بنیادی محوروں پر عمل کرنا لازم اور ناگزیر ہے پھر ان میں سے ہر محور سے کچھ جزئی محور منسلک ہیں۔

پہلا محور: منہج اور طریقۂ کار، اس سے ہماری مراد ایسے قواعد و ضوابط، شرائط اور رہنما اصولوں کا مجموعہ ہے جو فکر اسلامی کی تحریک میں نظم و ضبط پیدا کر سکے اور مسلم ذہن کو ایسے فکر کو وجود میں لانے کی سمت لگا سکے جو اسلام کے اغراض و مقاصد کو بروئے کار لانیوالا ہو اور اس کی کلی ہدایات و مقاصد سے ہم آہنگ بھی ہو۔

دوسرا محور: فکر ہے جس میں ہر انسانی اجتہاد اور ہر ذہنی اور علمی کاوش داخل ہے۔

تیسرا محور: تہذیب وتربیت ہے اور یہ تربیتی وعلمی نظام کے مطابق علم وآگہی کے ذریعہ انسانی ومعاشرتی پہلو کی تعمیر کا نام ہے۔ نیز خصوصیات، صفات، آداب اور فنون میں ترقی کے وسائل وجود میں لانے سے عبارت ہے۔ اسی طرح ذوق عام کو پروان چڑھانے کا نام ہے بالفاظ دیگر علوم ومعارف کا وہ مجموعہ ہے جو شخصیت سازی کا کام انجام دیتا ہے۔

چوتھا محور: تمدن وعمرانیات ہے۔ اور یہ ایجادات واختراعات کا وہ مجموعہ ہے جو انسان کے مادی وسائل کے دائرے میں وجود میں آتا ہے۔

ان محوروں میں سے ہر ایک محور کو تخلیق اور علم وآگہی کے انبار کی ضرورت ہے اور علم وآگہی اور تخلیقات کی ضرورت کا تقاضا ہے کہ:

(۱) امت کے تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ تخلیقی کاوشوں کی جانب مبذول کرائی جائے اور ان کے اندر تخلیقی کاوشوں کی اہمیت وضرورت کا احساس بیدار کیا جائے تعلیم یافتہ طبقہ کو اس جانب راغب کرنے میں جو وسائل بھی کارآمد ہوں ان کو استعمال کیا جائے۔

(۲) اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک افراد کی تربیت کی جائے جو بہترین صلاحیت کے حامل ہوں اور اس میدان میں کام کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہوں۔

۳ ایسا تہذیبی اور علمی منصوبہ پیش کیا جائے جس کے مبادی، مقاصد اور وسائل بالکل واضح ہوں اس کی تکمیل کے لئے جو مدت اور جو مراحل طے ہوں ان کے اندر ہی وہ مکمل ہو جانے والا ہو، منصوبہ کے ساتھ ہی نظر ثانی، تصحیح اور اس کی قدر وقیمت لگانے کے لئے کوئی صحیح معیار وضع کیا گیا ہو اس طور پر کہ تعلیمی وتربیتی وسائل سمعی وبصری ذرائع ابلاغ اور عوامی تہذیبی اداروں کے توسط سے امت اس منصوبہ میں حصہ لے سکے۔

مذکورہ بالا تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں غالباً سب سے زیادہ اہم اور معاون یہ ہے کہ مندرجہ ذیل وسائل وذرائع سے کام شروع کیا جائے۔

۱ ان تحریکوں کے افکار وخیالات کا مطالعہ جو امت میں تبدیلی لانے کی غرض سے

وجود میں آئی ہیں۔ جنھوں نے عالم افکار سے دلچسپی لی ہے اور اس کی قدر و قیمت کی تعیین کامیابی اور ناکامی کے پہلوؤں کی نشاندہی نیز ان تحریکوں کی فکری کاوشوں کا مطالعہ اور ان کی فکری تخلیقات کے تئیں رویہ اور ان سے استفادہ کے لئے تہذیبی رہنما وضع کرنا۔

(۲) ریسرچ وتحقیق کا کام کرنے والوں کی ایک جماعت سے مذکورہ بالا محوروں پر مضامین اور کتابیں لکھوانا۔

(۳) تعلیمی وظائف دنیا، ریسرچ کے سنٹر، علمی مراکز، اور دیگر ادارے جہاں تحقیقی کام ہوتے ہیں انھیں اس کی رہنمائی کہ وہ ان محوروں کو اولیت دیں۔

(۴) ایسے اداروں کے ساتھ تعاون جو ملتے جلتے مقاصد کے تحت قائم ہوں تاکہ ان کی معاونت سے متعین دائرے میں کام مشترکہ طور سے انجام پاسکیں۔

(۵) علمی مذاکرے منعقد کرنا، فکری و تہذیبی پروگرام پیش کرنا اور ان کی نشرواشاعت سمعی و بصری ذرائع ابلاغ نیز اخبارات کو ان کی ترویج کے لئے استعمال کرنا، افادیت کا جائزہ لیتے رہنا تاکہ عوامی ثقافت کے واسطے مناسب ماحول پیدا کرنے کی غرض سے زیر بحث مسئلہ کی جانب توجہ کرنے کی اہمیت کا احساس امت میں پیدا ہوجائے۔

(۶) جو تنظیمیں اور جو ادارے اس وقت اسلامی کاز کے میدان میں کام کررہے ہیں ان کے سامنے فکری پہلوؤں کی اہمیت بیان کی جائے، ان پر زور دیا جائے، ان کو فروغ دیا جائے اور ان اداروں اور تنظیموں کو مطمئن کیا جائے کہ صحیح عمل کے واسطے فکری پہلو کو اپنی محنت و کاوش کا زیادہ حصہ دینا ضروری اور بنیادی شرائط میں داخل ہے۔

۷ وزارت تعلیم و تربیت میں منہج اور طریقۂ کار طے کرنے کی غرض سے جو کمیٹیاں قائم ہیں اسی طرح وزارت ثقافت و نشریات میں پلاننگ کرنے اور پروگرام طے کرنے کے لئے

جو کمیٹیاں مقرر ہیں ان تک پہنچ کر انہیں ان محوروں کی اہمیت کا احساس دلایا جائے اور ان پر زور دیا جائے کہ وہ ان محوروں کا خصوصی اہتمام کریں۔

ہمیں اس حقیقت کا پورا احساس ہے کہ ایک ادارے یا ایک معہد کی جہدو کاوش سے کام کہیں زیادہ بڑا ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ کسی محدود وقت میں پورا ہو سکے اس لئے کہ یہ پوری امت کا مسئلہ ہے اس کے تعلیم یافتہ طبقے کا مسئلہ ہے۔ ایسا وسیع اور ہمہ گیر مسئلہ ہے۔ جسے زمان و مکان کی حدود میں مقید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے معہد اور اس جیسے دوسرے ادارے جو اس کام کے لئے مخصوص ہیں ان کا کردار یہ ہونا چاہیئے۔

(۱) مسئلہ کو نکھارنے اس کی وضاحت کرنے' اور اس کے مختلف پہلوؤں کو تفصیل سے بیان کرنے کی سعی و کاوش' واضح اور جملہ تفصیلات کے ساتھ پروگرام مرتب کرنا۔

(۲) تفصیلی اور اطمینان بخش نمونے پیش کرنا، ایسا نہ ہو کہ ابہام کی وجہ سے لوگ یا تو سرے سے مسئلہ کو ٹھکرا دیں یا اس سے چشم پوشی کریں یا سطحیت کی بنا پر یا تصحیح کا عمل رک جانے کی وجہ سے اس ضمن کی ساری کاوشیں رائیگاں چلی جائیں، یا سہل پسند ذہنیت کے حاوی ہونے یا تمدنی پستی کے سبب اس مسئلہ کو قبول کرنے اور اس کے لئے سعی کرنے سے عاجز ہو جائیں۔

(۳) تلاش و جستجو، تجزیہ' تفسیر' رہنمائی' تنقید' قدر افزائی' اور صحیح سمت میں کاروان کو رواں دواں رکھنے کا عمل جاری رکھنا۔

(۴) پروگرام' اس کے مختلف پہلوؤں اور وسائل کے بارے میں ذہن سازی اور ضروری معلومات فراہم کرنا، شرکت کا دائرہ وسیع کرنا تاکہ اس کے ذریعہ ایسے افراد دستیاب ہو سکیں جو اس مشن میں حصہ لینے اور تعاون کرنے پر قادر ہوں' ان کے کاموں کا جائزہ لیتے رہنا اور صحیح سمت میں گامزن رکھنے کے لئے ان کی رہنمائی کرتے رہنا۔

مذکورہ بالا چیزوں کے ذریعہ خصوصی ادارے اس مسئلے میں سوچنے والی اور پلاننگ کرنے والی عقل کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اور دوسروں کی صلاحیتوں کو منظم کرنے اور ان سے

کام لینے پر قادر ہو سکتے ہیں اسکے بجائے کہ سارا بوجھ خود ہی اٹھا کر گراں بار ہو جائیں ایسے ادارہ کیلئے مناسب ہے کہ وہ پورا سرمایہ فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے تعاون پیش کر دے، تفصیلات میں اپنی پوری کوشش صرف کرنے کے بجائے کام کرنے والوں کی نگہداشت کرے اور انکی رہنمائی کرے ایسا نہ ہو کہ ایک ادارہ کی ساری صلاحیتیں لگ جائیں اور کام جوں کا توں باقی رہ جائے، مندرجہ ذیل کام اس سلسلے میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

① ہر ایسے ملک اور شہر میں جہاں معہد کا کوئی دفتر ہو یا جہاں کوئی دوسرا معاون ادارہ موجود ہو وہاں علمی مذاکرے منعقد کرنے یا تعلیمی سیشن شروع کرنے کے لئے مذکورہ محوروں میں سے ہر محور میں تفصیلی رہبر اصول طے کئے جائیں، مقامی سیمناروں کے ذریعہ ذہن سازی کا کام کرنے کے بعد کثرت سے عالمی پیمانے کے سیمناروں کا انعقاد کیا جائے اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک طرف اس کے بارے میں امت کا شعور بیدار ہوگا تو دوسری طرف اس کے ذریعہ کچھ اچھی تحریری کاوشیں سامنے آئیں گی۔

② تیز رفتاری کے ساتھ اچھے مواد کی اشاعت تاکہ جملہ شعبوں میں ضروری مواد فراہم ہو سکے۔

③ تہذیبی و فکری شخصیتوں، اور یونی ورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں کے ساتھ کثرت سے روابط بڑھائے جائیں اور ان کی توجہ ان محوروں کی جانب مبذول کرائی جائے۔

④ یونی ورسٹیوں کے مختلف شعبہ جات کے سربراہوں اور ہائیر ایجوکیشن سے متعلق پروفیسروں سے قریبی رابطہ پیدا کرنے کا اہتمام" افکار و خیالات، علمی کاموں، منصوبوں اور پروگراموں سے ان کو روشناس کرتے رہنا اور ان کو قبول و اختیار کرنے کی دعوت دیتے رہنا۔

⑤ ہائیر ایجوکیشن پانے والے طلبہ سے رابطہ قائم کرنا اور ان کے سامنے مذکورہ محوروں سے متعلق تجاویز اور علمی پروگرام پیش کرنا۔

⑥ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں معاشرتی علوم کی ممتاز کتابوں پر مشتمل

کتب خانوں کا قیام، جو ہر شہر میں علمی شخصیتوں کا مرکز بنیں، اور اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرتی علوم میں بحث و تحقیق کے سلسلے میں ان کی رہنمائی کرنا۔

(۷) دراسات علیا یعنی ایم اے اور پی ایچ، ڈی کرنے والوں کے لئے ان محوروں کے ضمن میں موضوعات کا ایک مجموعہ تیار کرنا اور ان کو دراسات علیا (ہائیر ایجوکیشن) کے مختلف شعبہ جات میں رائج کرنا۔

(۸) مذکورہ محوروں سے متعلق اچھے مقالات کے ایک مجموعہ کا انتخاب نیز ان کیلئے منصوبے اور علمی رہبر اصول تیار کرنا، اور جو لوگ ان محوروں پر تحریری کاوشیں پیش کریں۔ ان کے لئے انعامات مقرر کرنا۔

(۹) اسلامی کی میدان میں کام کرنے سے رابطہ قائم رکھنا اور ان محوروں کے بارے میں مطلوبہ افکار پھیلانے کا انھیں میدان سمجھنا، نیز ان افراد کو مذکورہ محوروں کی اہمیت و ضرورت کا احساس دلانا اور انھیں باور کرانا کہ ان محوروں کو اختیار کرنا اور ان کی تکمیل کے لئے کام کرنا ضروری ہے۔

(۴)

موجودہ اسلامی حالات کے تکوینی عناصر

امکانات اور رکاوٹیں

مسلمانوں کے حالاتِ حاضرہ کے تکوینی عناصر جن سے عمل کے میدان اور اس کے بنیادی ڈھانچے تشکیل پاتے ہیں درج ذیل ہیں:

(أ) حکمران طبقہ
(ب) سیکولر عناصر
(ج) عمل اسلامی سے منسلک جماعتیں
(د) تقلیدی رجحان
(ھ) سطحیت اور پیوند کاری والے رجحانات و کاوشیں
(و) جمہور اور عوام الناس
(ز) ذیلی معرکے
(ح) ریسرچ و تحقیق کے حلقے
(ط) ذاتی غلطیاں

بلاشبہ یہی حالاتِ حاضرہ کے تکوینی عناصر ہیں۔ ان میں سے بعض مثبت پہلوؤں کے حامل ہیں جنھیں مزید ترقی دینا اور ان سے استفادہ کرنا ممکن ہے جبکہ بعض دوسرے منفی پہلوؤں کی حامل ہیں جو دشواریاں اور رکاوٹیں پیدا کر سکتے ہیں یا ایسے عناصر ہیں کہ اگر ان کو صحیح طور سے نہ سمجھا جائے اور اچھے ڈھنگ سے ان کو کام میں نہ لایا جائے تو رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ بعینہ اسی وقت ان کے اندر کامیابی کا ذریعہ اور محرک بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ بشرطیکہ ان کے لئے صحیح منصوبہ بندی کی جائے، صحیح رجحان

کی پالیسی تیار کی جائے، ان کے وسائل فراہم کئے جائیں، ان کے طریقۂ عمل کو پرکھا جائے، مسئلہ ان کے سامنے خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا جائے، اس کی اثر اندازی اور اثر پذیری کی نگہداشت کی جائے، ان کی مشکلات کی عقدہ کشائی کے بہترین سامان فراہم کئے جائیں، اور زیر بحث وزیر نظر قضیوں کے ساتھ اچھا رویہ اپنایا جائے مذکورہ بالا امور کے ذریعہ بعض دشواریوں اور رکاوٹوں کو امکانیات اور محرکات میں بدلا جا سکتا ہے بصورت دیگر دعوت عمل کی راہ میں وہ بدستور سنگِ گراں ہی رہیں گی۔

(أ) حکمراں طبقہ:

فکر اسلامی اور اعلیٰ تہذیبی شعور کے سلسلے میں عالمِ اسلام کے سرکاری حلقوں میں احتیاط وخوف کا رجحان غالب رہتا ہے جس کے بہت سے اسباب ہیں اور لوگ ان سے واقف بھی ہیں اس لئے ان کے شرح وبیان میں طوالت کی ضرورت نہیں، شاید نمایاں ترین اسباب میں سے وہ تمدنی کشمکش ہے جو اسلامی میدان میں اسلام، اس کی تہذیبی میراث اور اس مغربی تمدن کے درمیان برپا ہے جس کا تسلط واقتدار، فکر، تعلیم، تربیت اور ابلاغ کے اداروں پر قائم ہے۔ حکمراں طبقہ جو دراصل صحیح اسلامی فکر سے آگاہ نہیں ہوتا وہ ان اداروں کو اپنا بنیادی ستون تصور کرتا ہے۔ اسی لئے اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیمی وتہذیبی بدل پیش کرنے کا عمل اُن بہت سارے تعلیمی، تربیتی اور تہذیبی نظاموں کی پالیسی کے خلاف پڑتا ہے جن کا ملک میں عمل دخل ہے۔ یہ ایسے نظام ہیں جو کسی حال میں بھی اپنے خیالات کے مخالف یا مدمقابل کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ یہ نظام قائم ہی اس لئے کئے گئے ہیں اسلام کے فکری نظام کا بدل بن سکیں اور نوآبادیاتی ملکوں کے فرزندوں کی شخصیت سازی کے کاموں میں حصہ لے سکیں۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عالم اسلام میں تربیت وتہذیب کا کوئی موقع ہی دستیاب نہیں ہے۔ فکر، علم وآگہی اور تحقیقی کاموں سے وابستہ بہت سے افراد میں جنھیں صحیح صورت میں اسلام کو جاننے، پہچاننے کا موقع نہیں ملا ہے ایسے افراد ان اداروں میں

جن کے وہ ذمہ دار ہیں یا جن مراکز میں وہ کام کر رہے ہیں ان میں نافع اور سودمند چیز داخل کرنا چاہتے ہیں بشرطیکہ اس چیز کے صحیح اور نفع بخش ہونے کے وہ قائل ہو جائیں ان میں سے بعض لوگ اس قضیہ میں معاون بن سکتے ہیں۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ دوسروں پر پہلے ہی سے کوئی عمومی حکم لگانا مناسب نہیں ہوگا اس لئے ان عناصر تک پہنچنے اور انہیں کسی خاص گروپ کی طرف منسوب کرنے سے قبل نہایت ہوشیاری کے ساتھ ان کے حالات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ اس کی روشنی میں منصوبہ بندی کی بھی حاجت ہے۔ منصوبے کی رہنمائی میں ان افراد کے زیر عمل اداروں میں پہنچا جائے اور افکار و منصوبوں کے ذریعہ ان اداروں کی افادیت میں اضافہ کیا جائے۔

ایسے لوگوں کے سامنے مسئلہ کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرنے کی بڑی اہمیت ہے۔ ایسے خوش اسلوبی کے پیرائے میں اپنا فارمولا سامنے لایا جائے کہ اسے وہ بہت سارے بحرانوں کا حل تسلیم کرلیں جن سے وہ دوچار ہیں ان لوگوں کو ہم خیال بنانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ اسلامی دعوت و عمل کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہونے کے بجائے معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔ اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ایسے افراد کو اسلامی بدل کا مخالف یا مدمقابل نہ سمجھا جائے بلکہ ان کی فطرت کو زندہ کرنے اور ان کے اندر دینی میلان کو بڑھانے میں اپنی پوری صلاحیتیں لگا دیں تاکہ یہ لوگ اپنے اپنے اداروں میں فکری و تہذیبی اصلاح کے قضیے کو داخل کریں، اور مسئلے کے معاون بنیں نہ کہ اس کیلئے رکاوٹیں ثابت ہوں۔

(ب) سیکولر عناصر:

سیکولر یا لادینی عناصر کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسے بلاک اور گروپ ہیں جن کے لئے عمومی خطاب مفید ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کی ایک مخصوص جماعت یا اسمبلی ہوتی ہے اور اس کے کچھ چیدہ افراد ہوتے ہیں۔ چیدہ افراد ہوں یا جماعت اس کے لئے خصوصی خطاب سود مند ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر قوم کے اندر

ایک بڑی تعداد جمہور اور عوام الناس کی ہوتی ہے۔ جمہور کا معاملہ یہ ہے کہ جب ان کو دوسروں کے دباؤ اور اثر سے آزاد کر دیا جائے، براہ راست اس سے خطاب کیا جائے، پوری وضاحت کے ساتھ بات اس تک پہنچا دی جائے۔ عوام جن دشواریوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے ذریعہ تبدیلی کی ضرورت پر جمہور کو مطمئن کرنا، اس امت کی تعمیر نو میں اس کو شریک کرنا اور تمدنی وجود برپا کرنے میں اس کو لاکھڑا کرنا اگر یہ ممکن ہو جائے تو ایک خاموش اکثریت کے دائرے میں مطلوبہ تبدیلی رونما ہو جائے گی۔ اس خاموش اکثریت نے مخصوص جماعت یا اسمبلی کا ساتھ اس گمان پر دیا تھا کہ یہی اسمبلی امت کی تمناؤں اور اس کے اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ رہے سربرآوردہ افراد تو وہ عام طور سے اپنے مفادات اور اپنے مناصب کا پرزور دفاع کریں گے اور ہر ایسے بدل کا مقابلہ کرنے اور اس کو غلط ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے جس سے خود ان کا رول کمزور ثابت ہوتا ہو لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام سربرآوردہ افراد خلاف میں نہیں جائیں گے۔ چنانچہ جب ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے گا، ان کیلئے طویل المدت پروگرام تیار کیا جائے گا، مشترک امور کی تعیین کی جائے گی، نیز اسلامی منصوبہ کے حاملین ان سے اچھے پیرائے میں بات چیت کر سکیں، بحث و مباحثہ کی ضرورت پیش آئے تو حدود کے اندر رہتے ہوئے اس سے بھی دریغ نہ کریں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اتنی احتیاط برتیں کہ ان کے ساتھ نہ فقہی مناظرہ کریں اور نہ عقیدے کی بحث چھیڑیں نہ اپنے تفوق و بلندی کا مظاہرہ کریں اور نہ سرپرست کا رول ادا کریں تو سربرآوردہ افراد میں سے بہت سے لوگ اسلام کے بارے میں جانبداری کا رول چھوڑ کر غیر جانبدار بن جائیں گے اور جو غیر جانبدار ہوں گے وہ معاون و مددگار بن جائیں گے، اور جو اسلام سے دور اور بے تعلق تھے وہ اسلام کے فکری، ملی، تمدنی اور تہذیبی رشتے سے منسلک ہو جائیں گے اللہ کے فضل و کرم سے بہت سے عناصر نے اس جانب پیش رفت بھی شروع کر دی ہے۔

اس طرح اس گروہ کے ساتھ یہ سمجھ کر معاملہ ہو سکتا ہے کہ یہ اندرونِ اسلام ہی کا ایک حصہ ہے اسی طرح بہت سے افراد جو فکری اور علمی تذبذب کا شکار ہیں ان کو

تذبذب و کشمکش کے دلدل سے نکالا جا سکتا ہے اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مغربی تمدن کی جو بنیادیں ہیں ان میں سنجیدہ باوقار اور علمی نقد کیا جائے، اسی طرح غلطی کی اصلاح اور غلطی پر نقد کرنے کی اسلام نے جو حوصلہ افزائی کی ہے خواہ غلطی کا سرچشمہ کچھ بھی ہو، اس کی صحیح تصویر ان کے سامنے پیش کی جائے، مغربی افکار جن سے سیکولر عناصر کا فکری بیک گراؤنڈ تیار ہوتا ہے۔ علمی اور معروضی طور پر ان افکار و خیالات کی قدر و قیمت اجاگر کی جائے، جذباتی خطاب سے مطلق اجتناب کیا جائے، شرعی حکم لگانے یعنی انھیں کافر، بدعتی یا فاسق کہنے سے بالکل پرہیز کیا جائے۔

یہ لادینی عناصر چونکہ متنوع ہیں اس لئے ان کی جانب سے ردعمل کا اظہار بھی مختلف ہوگا چنانچہ ان میں سے بعض لوگوں کے نزدیک یہ فکری مسئلہ قابل تجدید تمدنی و تہذیبی رو کو بدلنے کی ایک نئی کاوش اور مسلم و عربی انسان کی تشکیلِ نو سے عبارت سمجھا جائے گا، بعض دوسرے لوگ تعصب کی بنا پر یا کسی مفاد کے نقصان پہنچ جانے کے ڈر سے یا تو صاف انکار کر دیں گے یا اس کی افادیت پر حملہ آور ہوں گے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسئلہ کو اس طرح زیر بحث لانا دراصل فکری، علمی اور تہذیبی طور پر اس کی جو پوزیشن ہے اس سے دور کر لے کی طرف ایک اقدام ہے۔

اس گروہ کی ایک بڑی تعداد کا حال یہ ہے کہ یا تو اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کے بارے میں سرے سے کچھ نہیں جانتی یا اگر اس کے پاس کچھ معلومات ہیں بھی تو غلط اور قابل اصلاح معلومات ہیں۔

چنانچہ جب فکری میدان میں سنجیدہ اور اچھی تحقیقات پیش کی جائیں گی جن کا معیار اتنا بلند ہو کہ عصری معیار کو چھو لیں، اسلامی فکری تحقیقات اسلامی اقدار اور موجودہ زمانے کے درمیان ربط و تعلق قائم کرنے پر قادر ہوں اور ایک عالمی تہذیبی اور تمدنی بدل کے طور پر اسلام کو پیش کر سکیں جس کے اندر انسان کی بنیادی مشکلات کا سامنا کرنے اور ان کا حل پیش کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اسی کے ساتھ اس طبقہ کے ہمراہ مثبت باشعور اور سودمند بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہے تو یہ کام ایسے افراد کو ہم نوا بنانے کا ضامن بن سکتا ہے جن کے اندر عقل و دانش بھی ہے اور معروضی انداز سے سوچنے کی روش بھی، جن کی موجودہ پوزیشن اسلام

دشمن میلانات یا ملحدانہ محرکات کے سبب نہیں ہے بلکہ ان کی موجودہ حالت کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھیں اچھے انداز سے اسلامی تعلیمات کا مخاطب بنایا ہی نہیں گیا ہے۔

ہماری رائے کی اس مثال سے تائید ہوتی ہے کہ اس طبقہ کے بعض لوگوں میں تہذیبی پختگی کے مرحلہ میں جاکر تبدیلی رونما ہوئی اور وہ پھر اسلامی تہذیب اور اسلامی فکر پر فخر و ناز کرنے لگے، حالانکہ یہی لوگ پہلے اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کے واسطے اجنبی ہی نہ تھے بلکہ سرے سے اس کے وجود ہی کے منکر تھے وہ کہتے تھے کہ اسلامی فکر یا اسلامی تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں ہے یہ محض بنیاد پرست لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے۔ بطور مثال ہم ڈاکٹر زکی نجیب محمود اور ان سے پہلے عباس محمود عقاد کا نام پیش کر سکتے ہیں۔

(ج) اسلامی کاز سے منسلک جماعتیں:

اسلامی تحریکوں اور اسلام کے میدان میں کام کرنے والوں کے ساتھ ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی اقدار، اس کے ابدی اصول و مبادی اور مسلمانوں کے فکری اجتہاد کے مابین خلط و اشتباہ ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فکری اجتہاد کا کام ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں رک سکتا ہے۔ اور فکر کے مسئلے میں جو بھی بحران پیدا ہوگا اس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ اقدار اور اصول و مبادی کو میدانِ عمل سے رخصت کر دیا جائے گا۔ انھیں حنوط لگا کر محفوظ کر دیا جائے گا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر خود اصول و مبادی کو تبرک و تقدس کے منصب پر فائز کر دیا جائے گا حالانکہ اقدار اور اصول و مبادی کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ حالات ان اصول و مبادی پر منطبق کیے جائیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مسلمانوں کے کاموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے۔

اسلامی تحریکیں بحیثیت مجموعی پورے طور پر اس مشکل کو دور نہیں کر سکی ہیں. اگرچہ بعض افراد کو تنبہ ہوا بھی تو وہ مطلوبہ نتیجہ برآمد کرنے سے قاصر رہے، ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ حالات نہایت پیچیدہ تھے. دار و گیر، ظلم و زیادتی اور فتنہ و شورش کے

حالات تھے۔ ایسے ماحول میں بعض تحریکوں کی قیادت ایسے لوگوں کی جانب منتقل ہوگئی جو حالات سے عہدہ برآ نہیں ہوسکے، کشمکش اور اس کا جو مزاج ہے اس کے دائرہ فکر سے الگ تھلگ رہ کر مہارت اور تجربہ حاصل کیا جائے نیز فکری اور سیاسی عمل کے انداز و اسلوب معلوم کئے جائیں تب جاکر کہیں فکر کی دور رس اہمیت کا ادراک ہوپاتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ زیر بحث مسائل میں تمدنی پہلو کا کیا مقام ہے؟

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ سابقہ قیادتوں میں سے بیشتر کے فکری مزاج پر قلعہ بندی اور محاذ آرائی کی چھاپ نمایاں ہے اور مقابلے کے واسطے ذہنی تیاری کا غلبہ ہے ان کی فکری کاوشوں کا حال یہ ہے کہ وہ جن حالات اور حبس دباؤ میں زندگی گذار رہے ہیں ان کی فکری کاوشیں ان حالات کا ردعمل ہیں جنھیں ہم بحران کی فکر سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ پھر اس بحرانی فکر پر اعتماد کرنے سے نیز حالات و ماحول کے عوامل کے تحت ایک نیا فکری بحران سامنے آتا ہے جس کے اندر کشمکش اور ظلم و زیادتی کے اثرات سے نکلنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، بات یہیں تک محدود نہیں رہتی ہے بلکہ اپنے حالات و خیالات کی تائید ماضی سے حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کے لئے فقہی اور عقائدی مسائل چھیڑے جاتے ہیں پھر گفتگو یا تو عقیدے سے متعلق کسی موضوع پر ہوتی ہے یا کسی فقہی مسئلہ پر، ساری توجہ ماضی کی طرف ہوکر رہ جاتی ہے حال کے مسائل حل کرنے، یا مستقبل کا اندازہ لگانے سے گریز کرنے کے لئے ماضی کے دامن میں پناہ لی جاتی ہے۔

مذکورہ اسباب کے علاوہ اسلامی مغرب کے علاقوں سے اسلامی وجود کے خاتمہ مذہبی طور پر ایران کے الگ تھلگ ہوجانے، ترکی کے مغربی فکر و تہذیب کے قالب میں ڈھل جانے، برصغیر ہند اور جنوب مشرق ایشیا کے مسلمانوں کے اپنی ہی پریشانیوں اور مقامی مسائل میں الجھ کر رہ جانے، مصر، شام اور عراق کے اسلامی کردار کے کمزور پڑ جانے اسی طرح اسلامی لہروں میں فقہی، تشریعی اور عقائدی رجحانات کے نمایاں ہونے، اور تمدنی نقطۂ نظر کے مدھم پڑ جانے، فکری کشمکش کے قضیوں سے عدم دلچسپی کی وجہ سے اسلامی میدان میں کام کرنیوالوں میں سے بہت سے لوگوں کا یہ احساس کہ اجتہاد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ

احساس کہ اگلوں نے پچھلوں کے کرنے کے لئے کچھ نہ چھوڑا یہ سب اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے اسباب کی وجہ سے ان تحریکوں میں اور ان تحریکوں کے واسطے تہذیبی تعمیر میں ذہن وفکر کا کردار دب کر رہ گیا، اس لئے کہ بیشتر تحریکیں اور جماعتیں فکری قضیے یا فکری بحران کو فکری تعیش سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی ہیں یا اسے امت کے بحران کی غلط تشخیص قرار دیتی ہیں یا امت کے تنظیمی وسائل اور ان کے تحریکی نظاموں سے تجاوز ٹھہراتی ہیں یا ان کو نص اور وحی کے مقابلے میں عقلی کاوش یا وحی کا بدل لانے کی لاحاصل کوشش سے تعبیر کرتے ہیں یا پھر وہ ان کے نزدیک فکر اور ذہن سازی کا ایسا منصوبہ ہے جس پر عمل کے نتیجے میں دوستی اور وفاداری کا سارا نقشہ ہی بدل کر رہ جائے گا اور قیادت پر سے عوام کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

یہ بات تسلیم کرنی چاہیئے کہ مغرب اسلامی، مصر، شام اور عراق میں موثر فکری میدان سے اسلامی تحریک کے ناپید ہو جانے کی وجہ سے دوسرے مکاتب فکر ظہور میں آئے جو اپنے مزاج، عناصر ترکیبی اور حالات کے باعث ایسی فکری کاوشوں کو وجود میں آنے سے نہ روک سکے، جنھوں نے زمانے کی مشکلات اور مسائل کے معیار سے تمدنی منصوبے اور ترقی یافتہ فکری بحث پیش کی اسلامی اور ملکی بلکہ کبھی کبھی عالمی پیمانے پر موثر فکری تخلیق کے انبار لگا دیئے، عوامی اشتراک کا دائرہ وسیع تر کر دیا، فکر اسلامی کو دفاع اور تیاری کی پوزیشن سے نکال کر انسانی مسائل میں شرکت اور انسان کی مشکلات کو حل کرنے کے مقام پر فائز کر دیا۔ اور یہ سارا کام مشہور اسلامی مدارس کے دائرے میں ہوا۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ جمہور کی تنظیم اور تنظیمی ضوابط کی تشکیل کا کام زیر بحث فکری اور تہذیبی منصوبہ کے مزاج سے خارج ہے البتہ اس کی سعی وکاوش یہ ہو گی کہ عوام میں حرکت ونشاط پیدا کر دے اور اس کے لئے فکری اور تہذیبی سرمایہ پیش کر دے۔ اور جمہور کی سوچ وفکر کا اولین مرکز فکری مسئلہ کو بنا دے اس لئے علم وآگہی کو اسلامیانے کی جانب رُخ کرنا میدانِ عمل میں بذاتِ خود کسی تحریک کا بدل نہیں بن سکتا، اس کا کام تو بس اتنا ہے کہ فکری پوزیشن کو مستحکم کر دے، البتہ فکری پوزیشن بجائے خود ہر تحریک کے لئے لازمی شرط ہے اور فکر، علم وآگہی اور تہذیب کے میدان میں صحیح کام ہے۔ ایک طویل عرصہ سے فکر کے مقام

اور اس کی پوزیشن کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ کم از کم اتنی بات تو ضرور کہی جا سکتی ہے کہ ضرورت سے بہت کم ادھر توجہ کی گئی یا تہذیبی پوزیشن کا انتخاب' فکری یا تہذیبی' یا علمی' یا تمدنی مسائل میں مشغولیت ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی ضامن ہوگی جنہیں اس رجحان کے بارے میں مطمئن کرنے کی ضرورت ہے کہ یہی رجحان امت کو گراوٹ سے بچائے گا۔ اس کی صحیح رہنمائی کرے گا۔ اور امت کے وسائل کو آلائش سے پاک وصاف کرے گا اندرونِ اسلام اور بیرونِ اسلام ہر دو میدان میں عمل کے لئے یہی رجحان تہذیبی رہبر عطا کرے گا امت کو زوال وادبار کی تباہی سے بچانے کے کام میں جو مخلصین مصروف ہیں ان کے ساتھ بھرپور تعاون کرے گا لیکن ان کی تحریکوں میں تنظیمی مناصب میں اور جمہور کی قیادت میں ان کا مدمقابل نہیں بنے گا، اسی طرح فکری نظریات کے مطابق عقائدی مسئلہ چھیڑنے سے گریز کرے گا۔ مبادا مکاتب فکر' افراد یا پورے معاشرے کی تکفیر کا فتویٰ صادر کرنے کی لغزش اس سے سرزد نہ ہو جائے' فقہی مسئلہ اور فرقہ وارانہ نوعیت کی بات سے بھی اجتناب کرے گا ورنہ دوسری جماعتوں سے اس کا شدید ٹکراؤ شروع ہو جائے گا۔

امت مسلمہ جسے اندر سے گھن لگ چکا ہے اور جو انتشار وافتراق کے آخری سرے پر پہنچ چکی ہے اسے آج ایسی فکری دستاویز اور تہذیبی دستور کی شدید ضرورت ہے جس میں شیرازہ بندی کرنے والے عناصر اور مشترک امور پر زور دیا گیا ہو اور اختلاف وتفرقہ بازی پیدا کرنے والے کاموں سے اجتناب کیا گیا ہو بلکہ متوازن اور معتدل فکری خیالات مخالفت کی خلیج کم کرنے ، اختلاف کے اخلاق وآداب سکھانے اور اختلاف کو مثبت میدان میں بدل ڈالنے کی تعلیم کا ذریعہ ثابت ہوں جن کے ذریعے نقطۂ نظر کو سرمایۂ رائے کو زرخیزی وشادابی اور شوریٰ کے پیمانوں کو تنوع فراہم ہو' ساتھ ہی وہ دستور اور دستاویز تکفیر' الزام تراشی' اور نیتوں کی کرید سے پاک وصاف ہو اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ صحیح عقائد کے نتائج اس کے دوررس اثرات' موجودہ فکری مسائل حل کرنے کی غرض سے اس کو نو ترتیب دینے کی ضرورت کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے حالانکہ عقائد کے مسائل اگر زمانے کے تقاضوں اور معیار کے مطابق ڈھال دیئے جائیں تو ہمارا معاشرہ ایک صحیح العقیدہ اور صحیح الفکر معاشرے میں بدل سکتا ہے جس کی تہذیب صاف ستھری ہو، ایسا معاشرہ جو اپاہج یا ڈھیلا ڈھالا نہ ہو بلکہ حرکت ونشاط سے بھرپور اور جذبۂ عمل سے معمور ہو۔

مسئلہ کو اگر فکری نہج پر چھیڑا جائے تو اس سے مختلف افراد اور تنظیموں کے موقفوں کا مطالعہ ان کا تجزیہ کرنے اور ان کا پس منظر جاننے کا داعیہ پیدا ہوگا ان کے اسباب اور محرکات کی جان کاری کی تحریک ہوگی جو ہمہ گیر فکری حل کے متقاضی ہیں۔

مذکورہ مطالعے، تجزیہ اور جانکاری کے عمل میں ایک فکری ضابطہ کے طور پر آدمی عقائدی اصول پر اعتماد کرے گا۔ شریعت سے رہنمائی حاصل کرے گا، شریعت کی روح اور اس کے مقاصد کا ادراک کرے گا۔ چنانچہ مسئلہ کو نہ تو بہت زیادہ پھیلائے گا اور نہ اس قدر اختصار کرے گا کہ فتویٰ اور عدالتی فیصلہ کی صورت اختیار کرلے، بلکہ اسے ایک ایسے قضیہ کی شکل میں پیش کرے گا جس کے اسباب کا وہ جائزہ لے رہا ہے اور جس کے علاج کے ذرائع کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا رہا ہے۔

اسلام کی خدمت انجام دینے والے، اور اسلامی کاز سے تعلق رکھنے والے افراد اگر فکری قضیہ کی اہمیت وضرورت کا ادراک کریں اور یہ جان لیں کہ عمل کے کارواں کو صحیح سمت میں گامزن رکھنے کے لئے اس شرط کی تکمیل ناگزیر ہے۔ اسی طرح اسلامی عمل کو حرکت میں لانے اور جمود سے بچانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ فکر کے عصری پیمانوں کو استعمال کیا جائے، یہ کام ایسے غور وفکر کی روشنی میں انجام پائے جس میں درایت ہو، عقیدہ پر مبنی سوجھ بوجھ ہو، عصری مسائل حل کرنے کے واسطے تمدنی شرعی فقہ ہو، اسی کے ساتھ کھلا ہوا ذہن ہو جس کے اندر مفید انسانی کاموں سے استفادہ کی پوری صلاحیت ہو ایسی صورت میں اسلامی خدمت انجام دینے والے افراد فکری مسئلہ کو اپنانے اس پر اعتماد کرنے اور اس سے استفادہ کرنے میں ذرا بھی تذبذب کا اظہار نہیں کریں گے اس لئے کہ سوچ وفکر کے منہج کو صحیح سمت دینا اور امت کی زندگی میں فکری قضیہ کو صحیح مقام عطا کرنا منہجی ذہن تیار کرنا، اور ترقی و بیداری کے منصوبوں میں فکر و منہاج کی اہمیت کی جانب توجہ مبذول کرانا ہی آج کا مطلوبہ کام ہے۔ چنانچہ موجودہ اسلامی جماعتوں کے بارے میں بجا طور سے کہا جاسکتا ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب، امام شوکانی، شاہ ولی اللہ دہلوی ان کے پیش رو اور ان کے بعد کے آنے والے اصلاح وتجدید کے داعیوں کی فکری کاوشوں ہی کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں۔

اسی طرح بعض ملکوں میں ان میں سے بعض تحریکوں کے اندر داخلی یا خارجی سطح پر یا ان تحریکوں کے رجحانات میں، یا فکر کے عصری دھاروں میں جو تبدیلی رونما ہو رہی ہے وہ بھی لازمی طور سے ان تحریکوں کو فکری قضیہ اپنانے پر مجبور کرے گی۔ ان تحریکوں کے اعتبار سے مسئلہ کی نوعیت یہ بنتی ہے کہ ان کے سامنے تسلسل کے ساتھ نیز دلکش انداز میں مسئلے کو پیش کیا جائے، مختلف انداز اور مختلف اسلوب میں مسئلے کو ان کے سامنے لایا جائے، عالم افکار کی تعمیر اور اس کی تطہیر کی ضرورت کا انھیں احساس دلایا جائے تاکہ تحریک کو ظن وتخمین اور برجستگی سے نکال کر سوچ سمجھے علمی منصوبے کے دور میں لایا جا سکے، منصوبہ بندی کرتے وقت موجود صلاحیتوں، گردوپیش کے حالات، ضروری شرائط، مطلوبہ اغراض ومقاصد، جدید وسائل، گذشتہ تجربات کے نتائج ماضی کی لغزشوں سے اجتناب، نوامیسِ فطرت کو حسبِ منشاء استعمال کرنے کی مہارت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مذکورہ چیزوں سے پورا پورا استفادہ کیا جائے۔

ایک اور بنیادی مسئلہ ہے جس سے چشم پوشی کسی صورت میں روا نہیں ہے وہ ہے فکری تحریک کی جڑ و بنیاد کو مضبوط کرنا اصل سرچشمے سے اس کا ربط قائم کرنا، اس سے تعلق کو مضبوط بنانا، اس کے دوررس اثرات کو بیان کرنا اور یہ بتانا کہ یہ کوئی نئی اور انوکھی چیز نہیں ہے بلکہ فکری وتہذیبی اصلاح کی کاوشوں کا جو ایک طویل سلسلہ ہے اسی کی یہ ایک مبارک کڑی ہے۔ فکری اور تہذیبی تسلسل ہے جو اسلامی تحریک کے ہم رکاب رہا ہے جو اس کے کارواں کو راہ راست پر چلاتا رہا ہے اس کے سرچشموں یعنی کتاب وسنت کی حفاظت کا کام جمع وتدوین اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ انجام دیتا رہا ہے اس کے بعد منہج اور طریقۂ کار کی تیاری، اس کو تحریری شکل میں پیش کرنے، نیز اصول ومبادی کے جمع وتدوین کا مرحلہ آیا۔ یہ دونوں مراحل دوسری صدی ہجری کے خاتمے تک طے ہو گئے، اس کے بعد امام غزالیؒ اور دیگر علمائے عظام کا دور آیا جنھوں نے فکری اور تہذیبی احیاء وتجدید کی راہ میں گراں قدر خدمات پیش کیں، ان ہی علمائے کرام نے صلاح الدین ایوبی، ابن حزم، ابن رشد، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور ابن خلدون کے عہد کے لئے راہیں ہموار کیں اس کے بعد اصلاح وتجدید کے موجودہ رہنماؤں کا زمانہ آتا ہے ان کی تحریکوں کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے فکری اصلاح

کے مسائل میں سے اجتہاد و تقلید جیسے اہم مسئلہ کو اپنا موضوع بنایا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی، شیخ محمد بن عبدالوہاب، امام شوکانی، شیخ جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، ابن بادیس، رشید رضا، اسی سلسلۃ الذہب کے چند روشن نام ہیں ان کے بعد موجودہ اسلامی تحریکوں کے قائدین کا نام آتا ہے جن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، شیخ حسن البناء شہید، سید قطب اور مالک بن نبی وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس قضیہ کو اگر اصلاح کی عمومی تحریکوں کے ساتھ جوڑا جائے جن کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوا ساتھ ہی گذشتہ تحریکوں کے کاموں کا غیر جانبدارانہ اور منصفانہ جائزہ لیا جائے، ان مقامات کی صحیح نشاندہی کی جائے جہاں کوتاہی سرزد ہوئی یا لغزش ہوئی یا خلل واقع ہوا ساتھ ہی جائزہ لیتے وقت مثبت اور معروضی انداز اختیار کیا جائے تو یہ عمل ان تحریکوں کے لئے اطمینان کا باعث ہوگا، اور اس قضیہ کو سمجھنے اور اس کو قبول کرنے پر ان کو آمادہ کرنے والا ہوگا پھر وہ تحریکیں ان شاء اللہ اس کام کو خوش آمدید کہیں گی اور اس کو ایک معاون دریا کی حیثیت سے دیکھیں گی جس کا منبع اور سرچشمہ ایک ہی ہے، صرف راستہ کسی قدر جدا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مفہوم کو یوں ادا فرمایا ہے:

قل ما کنت بدعا من الرسل۔[1] "میں کوئی نرالا رسول نہیں ہوں"۔

ایک تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ کچھ اصطلاحوں اور نعروں کے کچھ متعین مدلول پہلے سے ذہنوں میں جاگزیں ہوگئے ہیں۔ ان میں سے جہاں کہیں کوئی لفظ یا فقرہ کسی کی تقریر یا تحریر میں آیا کہ عمومی ذہن پہلے سے متعین مدلول کی جانب منتقل ہوجاتا ہے حالانکہ اس کا پورا امکان موجود ہے کہ استعمال کرنے والا اس کو حقیقی معنی میں استعمال کر رہا ہو، یا اس کے ذہن میں کوئی اور مدلول ہو، مذکورہ اصطلاح یا شعار کے صحیح مفہوم کا اگر ادراک نہ ہو تو یہ چیز بھی اسلامی میدان میں کام کرنے والوں اور دیگر لوگوں کے درمیان نفسیاتی دیوار بن کر حائل ہوجاتی ہے کسی تقریر یا تحریر میں جہاں کہیں وہ لفظ آیا کہ لوگ محتاط ہوجاتے ہیں اور اس کا

---

[1] سورہ احقاف: ۹

ربط وتعلق ان رجحانات سے جوڑنے لگتے ہیں جو عوام میں نامقبول ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنی ادبیات، تقریروں، اور تحریروں میں کافی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اپنی تحریری کاوشوں اور خطابوں میں ایسے ذو معنی اور مبہم الفاظ و اصطلاحات کے استعمال سے حتی الوسع گریز ہی کرنا چاہیئے۔ یہ انتباہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نزاعی امور، گروہی طرفداری اور کشمکش میں مرکزی کردار بننے سے اجتناب حددرجہ ضروری ہے۔ اس کے برعکس عالمی اخوت کے جذبہ کو فروغ دینا چاہیئے، خطاب کا اسلوب و انداز عمومی اور آفاقی اپنانا چاہیئے، ایسا نہ ہو کہ پیش کردہ افکار و آراء سے کوئی مسئلہ سلجھنے کے بجائے کوئی نیا بکھیڑا اٹھ کھڑا ہو، اس طرح بحران کے قدیم عناصر میں مزید ایک عنصر کا اضافہ ہو جائے گا جس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ تحریک اپنے ہی حصار میں محدود ہو کر رہ جائے گی اور اُمت کے واسطے کوئی قیمتی چیز پیش کرنے سے عاجز و درماندہ ہو جائے گی۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ جو لوگ فکری اور تہذیبی رجحان کے حامل ہیں ان کی جانب سے اگر فکری منصوبے پیش ہوں۔ اسلامی میدان میں کام کرنے والوں پر مشتمل سیمینار منعقد کئے جائیں، ان کے درمیان باہم مذاکروں کی شروعات ہوں۔ کام کرنے والوں کے عملی تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے، نزدیک سے ایک دوسرے سے تعارف ہو تو ان امور کے ذریعے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ نفسیاتی رکاوٹیں زائل ہو جائیں گی، اسلامی بنیادوں تک پہنچنے کی راہ میں جو بہت سی دیواریں رکاوٹ بن چکی ہیں وہ از خود منہدم ہو جائیں گی اور سست روی کے ساتھ تبدیلی کا عمل ایک مشترک اور منظم فکری عمارت کا روپ دھار سکتا ہے۔

تہذیبی قیادتوں کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار رکھنے، تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مخاطب بنانے، تہذیبی اجتماعات میں شرکت کرنے، ایسی چیزوں کے پیش کرنے جو انہی اقتدار پر آمادہ کریں اور منہج کی ترغیب دلائیں، ان چیزوں کے ساتھ ساتھ اگر مذکورہ بالا امور کا لحاظ کیا گیا تو ان شاء اللہ روز بروز مسئلہ کی نوعیت سمجھنے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ اور لوگوں کے اندیشے دور ہوتے چلے جائیں گے پھر یہ میدان دشواریوں سے امکانات میں بدل جائیں گے۔ اسی کے ساتھ اسلامی تحریکوں سے وابستہ افراد کے اندر دین اسلام کے عالمی اور آفاقی ہونے کا شعور عام کرنا ازبس ضروری ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور کام بھی مفید ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے مخاطبین کو یہ ذہن نشین کرایا جائے کہ اسلام تمام ادیان پر غالب آنے کے لئے آیا ہے۔ نیز پیغام محمدی ایک ابدی پیغام ہے اس پیغام کا عالمی ہونا اس کے پھیلاؤ اور کھلے ہونے پر مبنی ہے نہ کہ اپنی ذات کے اندر سکڑنے اور اپنے دائرے میں محصور ہونے پر ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اسلام کی دعوت تمام انسانیت کے سامنے پیش کی جائے، اس طور پر کہ اس کا خطاب تمام تہذیبوں اور تمام تمدنوں کے لئے موزوں ہو اس کے اندر جماعتی، قومی، اور جغرافیائی حدود سے باہر نکلنے اور اوپر اٹھنے کی پوری صلاحیت موجود ہو، دنیا کو بتایا جائے کہ نبوتِ محمدی گذشتہ تمام نبوتوں کی وارث ہے۔ پچھلی نبوتوں کی بہترین خصوصیات اس کے اندر موجود ہیں۔

اسلام کے عالمی ہونے کا تصور خطاب کے عالمی ہونے کو ضروری قرار دیتا ہے۔ ہر قسم کی حدود اور پابندیوں کو خیرباد کہنے کو لازمی ٹھہراتا ہے۔ اور ہر قسم کے دینی اور تمدنی اختلاف کا احاطہ کرنے اور اس پر قابو پانے کو ناگزیر قرار دیتا ہے۔ لہٰذا ہر جزئی، مسلکی اور گروہی دائرہ جو اسلامی خطاب کی آفاقیت کو متاثر کرے اس کے عالمی احاطے کی صلاحیت وقدرت کو کم کرے، اسلامی نقطۂ نظر سے اس قسم کا ہر دائرہ قابل رد ہے۔ کیونکہ وہ دین کے مستقبل پہ اثرانداز ہوگا۔

فکری عمل اور تہذیبی جہاد ہی اسلامی خطاب کے عالمی ہونے کی شرائط پوری کرنے کے ضامن اور کفیل ہیں۔ اس زمرے میں جب یہ شعور عام ہو جائے گا تو وسائل و ذرائع اور شرائط میں ان بہت ساری اصلاحات اور تبدیلیوں کو قبول کرنے کے لئے ذہن تیار ہو جائیں گے جو خطاب اسلامی کی آفاقیت کے لئے مفید اور ضروری ہیں۔ یہ پہلو دینی علوم کی تدریس اور مطالعہ کے زمرے میں بھی مفید ہے تاکہ زمان و مکان کے تقاضوں اور اثرات کے نتیجے میں جو کلامی اور فقہی مسائل وجود میں آگئے ہیں اور جن کی افادیت موجودہ زمانے میں ختم ہو چکی ہے ان سے اجتناب کیا جائے۔

د۔ تقلیدی رجحان:

یہ طبقہ فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث اور زبان وادب جیسی قدیم تعلیم

وثقافت کا حامل ہے۔ دیکھنے میں آتا ہے کہ اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں اسلام کا سرکاری ترجمان تسلیم کیا جائے، ان کے ذہن میں یہ بات رچ بس گئی ہے کہ اسلام بالخصوص علم وآگہی کے میدان میں گفتگو کا حق صرف انہیں حاصل ہے۔ اور ان ہی کی معلومات سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس پر انہیں فخر وناز بھی ہے۔ چنانچہ فکری کاوشوں کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ یہ ساری کاوشیں ان کے مقام سے ان کو بے دخل کرنے کے لئے ہو رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فکری کاوشوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔

ہمارا پختہ یقین ہے کہ اسلام کے مخاطب ساری دنیا کے انسان ہیں، ذکر ونصیحت کے لئے اسلام آسان بھی ہے اور لوگ بلا کسی واسطہ اور ذریعہ کے اللہ تعالیٰ سے لو لگا سکتے ہیں اس کے باوجود آج صورتِ حال یہ ہے کہ علوم شرعیہ کے حاملین، اور دینی اداروں کے فارغین میں سے ایک طبقہ اپنے بارے میں اسلامی ترجمان ہونے کے وہم میں گرفتار ہے۔ اس کے نزدیک اسلام کی ترجمانی کا حق اس کے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ جاننے والا نہ جاننے والے کے مقابلے میں حجت ہے۔ جاننے کا راستہ یہی ہے کہ عامی شخص اہل علم سے پوچھے لیکن دشواری یہ ہے کہ بعض لوگ اپنی ذات اور اپنی آرا، کو تقدس کا درجہ دے ڈالتے ہیں۔ اس لئے پوری سنجیدگی اور وقار کے ساتھ اور جلد بازی کو راہ دیئے بغیر جدوجہد کرنی ہوگی کہ اشخاص اور ان کی اجتہادی رایوں کو جو تقدس حاصل ہو چکا ہے وہ زائل ہو، جہاں تک ممکن ہو تقابلی فقہ کے دائرے کو وسیع کیا جائے، اجتہادی رایوں میں تنوع کو فروغ دیا جائے تاکہ بات چیت، تنقید، رد اور بحث ومباحثہ کے واسطے ذہن کی تربیت ہو سکے، بہرحال کسی بھی جماعت یا طبقہ کو بزعم خود خدائی ترجمان بننے کا حق نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اسے نہ بھولنا چاہیئے کہ نہ تو اسلام کا آغاز ہی اس طبقہ سے ہوا ہے اور نہ یہ بات ہے کہ اس طبقہ کے خاتمے سے اسلام مٹ جائے گا، اس لئے کسی جماعت کا اپنی اجتہادی رائے کو حتمی طور سے خدائی مراد قرار دینا درست نہیں ہے اس میں بڑی نزاکتیں اور خطرات ہیں فکر ونظر میں وسعت پیدا کر کے فکری دہشت گردی کی فضا ختم کرنے کا عمل

شروع کیا جا سکتا ہے کیونکہ فکری دہشت گردی عقل کو جلاوطن کرتی ہے اور فکر و تدبر پر قدغن لگاتی ہے۔ اس صورت حال کے ختم ہونے کے بعد عقل کے سامنے ایک وسیع میدان ہوگا۔ اسی طرح فقہی اجتہاد کی حوصلہ افزائی کرنے، بات چیت اور بحث و مباحثہ کے لئے متنوع طریقے اپنانے اور اجتہاد کا دروازہ مکمل کھول دینے سے دیگر فقہی اور فکری اجتہادوں کو تقویت ملے گی اور اس کی افزائش کی راہ ہموار ہوگی، اس کام کے ذریعہ علماء کا طبقہ اپنے وجود کا ثبوت پیش کر سکے گا۔ فکری میدان میں اپنی افادیت تسلیم کرا سکے گا، زمانے کے مسائل پر اسلام کو منطبق کر سکے گا۔ اور اسلام کے ذریعہ لوگوں کی زندگی اور ان کے عمل و کردار کی اصلاح کر سکے گا

دینی علوم کے ماہرین کو یہ حقیقت مان لینی چاہیے کہ دینی علوم شرعی حکم جاننے کا ذریعہ اور وسیلہ ضرور ہیں لیکن اسی کے ساتھ انسان کے موجودہ حالات سے واقفیت اور تہہ تک پہنچنے کے لئے تجزیہ و تحلیل کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے دوسرے ذرائع کو اختیار کرنا ہوگا، ان معاشرتی عوامل کو تلاش کرنا پڑے گا جو حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں مختصر یہ کہ دوسرے عوامل کو یکسر نظر انداز کر کے صرف شرعی علوم کی مدد سے انسان کے موجودہ حالات پر کوئی حکم لگانا ایک ناقص عمل ہوگا۔ ہمارے نزدیک معاشرتی علوم کی جانب توجہ مبذول کرنا اور اس سے استفادہ کرنا ایک ناگزیر شرعی ضرورت میں داخل ہے۔ علوم شرعیہ کے حصول کی ضرورت سے معاشرتی علوم کے حصول کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ ورنہ اسلامی فقہ اور اسلامی فکر دونوں ہی زندگی کے دائرے سے خارج ہو جائیں گے اور ان کی افادیت محدود سے محدود تر ہوتی چلی جائے گی۔

مطلوبہ فکری منصوبہ اور علم و آگہی کو اسلامیانے کا قضیہ دراصل امت کے امراض کی تشخیص ہے اور اسلامی اجتہاد ان امراض اور مسائل کے لئے دوائے شافی ہے بعض لوگ اجتہاد کا آوازہ تو بلند کرتے ہیں لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کی ان میں جرأت نہیں ہوتی، اس لئے بھی ایسا ہوتا ہے کہ اجتہاد کے لئے مطلوبہ وسائل ان کے دسترس سے باہر ہوتے ہیں اس لئے انھیں تقلید ہی میں عافیت نظر آتی ہے اس کے برعکس اجتہاد میں جفاکشی بھی ہے اور ذمہ داری بھی، بہت سے خطرات اور بہت سی دشواریوں کا سامنا بھی، زیر نظر قضیہ کی

کوشش ہوگی کہ کلامی نقطہ نظر سے بحث و مناظرہ کا رنگ اختیار کرنے سے گریز کیا جائے اسی طرح فقہی جزئیات میں بھی عموم ذہنی موشگافیوں سے اجتناب کیا جائے، کیونکہ کلامی مسائل کا چھیڑنا تباہ کن ہوگا، اسی طرح فقہی مسائل کو ان کے اثرات کا اندازہ لگائے بغیر اور ان کیلئے ضروری شرائط کا لحاظ کئے بغیر اگر چھیڑا گیا تو اس سے امت کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا اور اس کی وحدت جس حال میں بھی ہے برقرار نہ رہ سکے گی اسی لئے زیر بحث پروگرام میں اصرار کیا گیا ہے کہ انسانی، زمانی اور مکانی تبدیلیوں کے اثرات ملحوظ رکھے جائیں، کلیات اور مقاصد پر نظر رکھی جائے اور ان میں سے ہر ایک کو اس کے مقام پر اور اس کے دائرے میں رکھا جائے۔

مدارس اور دینی اداروں کے بعض فضلاء کا یہ تصور بھی کچھ کم پیچیدگی کا حامل نہیں ہے کہ قدیم موروثی فقہ ہمارے ہر درد کا درماں ہے"۔ اور یہ کہ" اگلوں نے پچھلوں کے لئے کوئی کام نہیں چھوڑا ہے" اسی لئے یہ طبقہ ہر نئی تجویز کے بارے میں اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار نظر آتا ہے۔ یا اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں ناقابل برداشت بوجھ محسوس کرتا ہے یا سرے سے عدم اہلیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے نزدیک نئے فکری اجتہادات کی صورت میں وہ حرج اور تنگی میں پڑ جائے گا اس کی دون ہمتی کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ نئے فکری اجتہادات کے واسطے ضروری ساز و سامان فراہم کرنے اور وسائل و ذرائع مہیا کرنے سے پہلے ہی اپنی بے بسی، پریشانی اور ناکامی کا واویلا شروع کر دیا جاتا ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں جس کا نفس پر اثر نہ پڑے صورت حال یہ بنتی ہے کہ یہ طبقہ ساری ذمہ داری دوسروں کے سر ڈال کر غور و فکر اور اجتہاد سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتا ہے اس کے نزدیک اسلام اور اسلامی مسائل پند و نصائح، وعظ اور بزرگانہ کلمات و ہدایات میں ڈھل جاتے ہیں اگر حالات سازگار ہوں تو وہ فتوے صادر کرنے لگتا ہے اور ایسے لوگوں سے ان فتووں کے سمجھنے اور ان کی تنقید کا مطالبہ کرتا ہے جو سرے سے اس کے اہل نہیں ہیں۔ یہ طبقہ لوگوں کو باور کراتا ہے کہ غلطی، انحراف، کوتاہی اور پسماندگی کا ذمہ دار وہ نہیں دوسرے لوگ ہیں، اگر لوگ میری سنتیں اور اس پر عمل کریں تو دنیا میں لوگوں کے حالات درست

ہو جائیں اور آخرت میں دخولِ جنت کے سزاوار قرار پائیں، رہی یہ بات کہ لوگ اسے کیسے نافذ کریں؟ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کیسے کریں؟ اس کے لئے ضروری وسائل کیا ہیں؟ اور زمانے سے ہم آہنگ شرعی پیمانے کیا ہیں؟ اسلامی فکر کا مطالعہ کس طرح کیا جائے؟ اور اس مطالعے کی روشنی میں کس طرح اصول سازی کا کام کیا جائے؟ تو یہ چیزیں ان میں سے بہت سے لوگوں کے تصور سے بھی بلند نہیں ہیں اور جہاں تک اس کو نافذ کرنے کے لئے عملی پروگرام کا معاملہ ہے اور یہ سوال کہ مختلف نسلوں کی کیسے تربیت کی جائے کہ وہ اسے سمجھ کر ہضم کر سکیں اور عملی زندگی میں اس کی پابندی کریں تو یہ ایسی ذمہ داری ہے جسے دوسروں کو انجام دینا چاہیے۔

ٹھہراؤ، جمود، اور تقلید کی یہ صورتِ حال آپ کو ہر اس فکر میں نظر آئے گی جہاں ذمہ داریاں بٹی ہوئی ہیں۔ ہر ایک کا رول متعین ہے۔ پھر بدقسمتی سے اگر ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا مطالبہ بھی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے یا دیانتداری کے ساتھ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنے کے بجائے ایک دوسرے پر الزام واتہام کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس طرح اس فکر میں مخالفت اور مقابلہ کی صلاحیت ابھرتی ہے۔ اس چیز سے مخالفین فائدہ اٹھاتے ہیں، کسی بھی فکر اور منصوبے کی راہ میں یہ زبردست رکاوٹ ہے، نہ صرف اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے غور وفکر کی ضرورت ہے بلکہ اس کو موافق اور کارآمد بنانے کی بھی فکر وسعی کرنے کی حاجت ہے۔

صفائی ستھرائی اس گروہ کی ایک نمایاں صفت ہے۔ جہاں کہیں بھی انہیں اسلام کی خدمت ہوتی نظر آتی ہے ان کے اندر مسرت وشادمانی کا احساس ابھرتا ہے بس شرط یہ ہے کہ ان کے ذہن ودماغ میں جو تصورات جاگزیں ہو چکے ہیں ان سے یہ خدمتِ اسلام ٹکراتی نہ ہو، اس لئے ہمارا خیال ہے کہ اس گروہ کے جو اختصاصی پہلو ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے زیرِ بحث قضیہ پر فنی لحاظ سے بحث ومطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس طرح ان کے اندر سے منتخب نوجوان صلاحیتوں کو جو خوش فکر اور روشن خیال ہوں جمع کر لینا اور انفرادی واجتماعی ریسرچ کے کاموں میں مشغول کر دینا ممکن ہو سکے گا۔ ان نوجوان

صلاحیتوں کے لئے قدیم کتابوں کا حصول آسان بنا کر ان کے اندر اصل مصادر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر کے کانفرنسوں اور سیمناروں میں ان کو شریک کر کے علمی موضوعات پر ان سے گفتگو کر کے ان کو کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔ جس فن میں انھیں مہارت حاصل ہے اس فن میں ان سے مشورے کئے جا سکتے ہیں۔ مختلف ڈھنگ سے ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے مشوروں ہی تک بات محدود نہ رہے بلکہ ان لوگوں کے لائق جو کام ہو ان کے سپرد کیا جائے ان کی کارکردگی پر نظر رکھی جائے، ایک محدود وقت کے اندر اندازہ ہو جائیگا کہ ان میں کتنے لوگ کارآمد ثابت ہوں گے؟ اور کتنے لوگوں کے اندر مطلوبہ تبدیلی لانے کے لئے آمادگی پائی جا رہی ہے اور کتنے ٹھس اور بیکار ہیں

جس وقت یہ نوجوان قضیہ کو اچھی طرح سمجھ لیں گے اور امت کے مختلف میدانوں اور شعبوں کے ماہرین کے ساتھ اس قضیہ کو اپنانے اور دوسروں تک پہنچانے میں اہم قائدانہ رول ادا کریں گے تو یہ مطلوبہ کردار خود ہی ان سے تجاہل اور نسیان کے گرد و غبار کو صاف کر دے گا۔ ان کی قوتِ کارکردگی میں تازگی و توانائی پیدا کر دے گا اور خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد جس ضمنی کردار میں الجھا دیئے گئے تھے اس سے ان کو نجات دلا دے گا۔ اپنے اس ضمنی کردار پر قناعت کر لینے کے باعث وہ بعض حکمرانوں کی جانب سے سیاسی استبداد اور اجتماعی زیادتی کا نشانہ بن رہے ہیں اور مسلسل ان کا استحصال کیا جا رہا ہے، جس وقت ان نوجوانوں نے صورتِ حال کا صحیح ادراک کر لیا تو ان میں سے بہتیرے نوجوان اس قضیہ کے موافق و معاون بن جائیں گے۔ اگر ایسا ہو گیا تو اس میں اسلام اور مسلمانوں دونوں کیلئے بہتری ہے۔

اسی طرح اس قضیہ اور اس کے مقاصد کے سلسلے میں امت کے اندر جب عمومی احساس بیدار ہو گا تو اس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر تبدیلی بھی آئے گی اور دھیرے دھیرے وہ ہم نوا بھی بن جائیں گے البتہ یہاں پر یہ انتباہ ضروری ہے کہ کسی بھی شخص کو یہ اجازت نہ ہونی چاہیئے کہ قضیہ میں پیش کردہ آراء کو اپنے لئے نئے اقتدار کا پیش خیمہ سمجھنے لگے، یا ایسا باور کرانے کی کوشش کرنے لگے کہ اس کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے تاکہ وہ اپنے محدود میدان عمل سے تجاوز کر کے دیگر ثقافتی میدانوں میں اپنی بالادستی کا جھنڈا بلند کر سکے۔

اس لئے علمی تحریروں، اور منہجی اصلاح کے ضمن میں جس کے ذریعے جملہ اختصاصات اور مہارتوں کے شعبے سے وابستہ افراد کے کردار اور میدان عمل کی تعیین وتجدید ہوتی ہو تسلسل کے ساتھ وضاحت ہوتی رہنی چاہیئے۔ ایسا کرنے سے ہر قسم کی پیچیدگی اور الجھاؤ از خود دور ہوتا رہے گا۔ قضیہ کو غیر ماہرین سے پاک رکھا جاسکے گا اور اس کی معروضیت کی حفاظت ہو سکے گی۔

اسی طرح علم وآگہی کو اسلامیانے کا مسئلہ متقاضی ہے کہ اس کے پروگراموں میں ایک معتدبہ حصہ اس نوع کی تعلیم اور معلمین میں تبدیلی لانے کے لئے خاص کیا جائے، اس کے بغیر مقصد کا حصول دشوار ہے۔ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیئے کہ علوم نقلیہ (دینی علوم) کے دونوں قسم کے حاملین خواہ وہ علوم آلیہ (وسائل وذرائع) کے حاملین ہوں یا علوم عالیہ (مقاصد) کے وہ علم وآگہی کے دو بنیادی پہلوؤں سے ناواقف ہیں۔

پہلا پہلو: اسلامی کاوشوں کے زمانے کی معرفت، یعنی تدوین کے زمانے سے پہلے تدوین کے زمانے میں اور تدوین کے زمانے کے بعد اسلامی علم وآگہی کی بنیاد کیونکر اور کیسے پڑی، کتاب اللہ، سنت رسول اور صدر اول کے علمی سرمایہ کے ساتھ مسلمانوں کا طرز عمل کیا رہا؟ اور ان دونوں کی مدد سے ناخواندگی کی حالت سے علمی وتہذیبی حالت کی جانب سفر کا آغاز کیسے ہوا؟ صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں نے علم وثقافت کو فروغ دیا بلکہ اس سے خوشہ چینی کر کے مسلمانوں نے مضبوط بنیادوں پر اپنے تمدن کی عمارت تعمیر کی، ان باتوں کی صحیح واقفیت بہت ضروری ہے۔

بہت سے مسلمان جن میں سرفہرست علماء کرام ہیں غیر تجزیہ شدہ تاریخی معلومات کی روشنی میں اس وقفہ کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں اسی کو وہ حرف آخر سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ تو یہاں تک دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ یہ علم بدیہیات سے قریب تر ہے۔ حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں بہت سارے سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا تشفی بخش جواب ہنوز باقی ہے۔ کیونکہ ایسے مقامات سے تیز رفتاری کے ساتھ گذر جانے کا معمول سا بن گیا ہے۔ ٹھہر کر سوالات پر غور کرنے اور ان کا جواب تلاش کرنے کی زحمت سے گریز کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان مسائل کا ازسرنو مطالعہ کیا جائے لیکن

تاریخ تشریع یا تاریخ فقہ اور توصیفی منہج کے آئینے سے نہیں بلکہ تجزیاتی منہج کی مدد سے تحقیقی مطالعہ ہو جو اس عرصہ کے مسائل کے مختلف عناصر کو جدا جدا کر کے دیکھے اس کے متعلقات کی از سر نو ترتیب قائم کرے جس کے ذریعہ اس دور کے قضایا میں سے ہر قضیہ کا پس منظر معلوم کر لے، اس کے جو آثار و ثمرات مرتب ہوں ان کو جان لے اور ان کے اندر موجودہ زمانے کے لئے جو اسباق اور عبرت کے جو سامان ہیں ان کو آشکارا کر دے، اس کے برعکس شرعی علوم کے طلبہ اخباری اور وصفی معلومات حاصل کرنے کے طریقے سے مانوس ہیں جن کو بغیر کسی تحلیل و تجزیہ کے قبول کرنے اور تسلیم کر لینے کے لئے پہلے سے تیار بیٹھے ہوتے ہیں مسئلے کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی بھی پہلو سے متعلق ابھرنے والے سوال کا کوئی مناسب جواب پہلے سے سوچ لیتے ہیں تاکہ دوبارہ تذبذب کا شکار نہ ہوں، پھر بھی اگر سوال پر اصرار رہا، سوال کرنے والے کا منہ بند کرنا ممکن نہ ہوا تو بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں، قدماء کے نزدیک عام طور پر ہر قسم کے سوالات کے جوابات تیار ملتے ہیں ان کی جانب رجوع کر کے ان کے دامن میں پناہ لی جاسکتی ہے۔ اس طرح اس دقفہ کے افکار و خیالات کی حفاظت اور پابندی کی جاری ہے۔ تقریباً یہی حال دوسرے قضایا و مسائل میں بھی ہے جن میں سے بعض قضایا کا سامنا کرنے کیلئے ہمیں ان افکار کے گڑے مردے کو دوبارہ اکھاڑنا پڑتا ہے۔

اس موقف کے پس پشت جو حسن نیت اور سلامتِ مقصد کارفرما ہے اس کے بارے میں ہمیں ذرا شبہ نہیں ہے۔ دراصل اس کا مقصد "سدّ ذریعہ" ہے جب یہ فرض کر لیا جاتے کہ قدیم علمی سرمایہ کے دوبارہ مطالعہ کا مقصد صرف کمزور پہلو کی تلاش ہے تاکہ اسلاف کے بارے میں اخلاف کا اعتماد متزلزل کر دیا جائے تو روایت پرست طبقہ کا یہ رویہ قابل فہم بھی ٹھہرے گا اور قابل قدر بھی، لیکن جب اس حقیقت کا پوری طرح ادراک ہو جائے کہ قدیم علمی سرمائے کو سمجھنے، ان کے اندر مستور حقائق کو آشکارا کرنے، عبرت و نصیحت حاصل کرنے، کھرے کھوٹے کا فرق واضح کرنے، اور ان سب کے نتائج جاننے کے لئے دوبارہ مطالعہ کرنا ضروری ہے تو باور کرنا چاہیے کہ یہ خود سلف ہی کے منہج اور طریقۂ کار کا ایک جزء ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت نقد و جرح کے جو معیار متعین تھے ان کو بنیاد بنا کر انھوں نے سندوں پر کلام کیا

اور متونِ حدیث پر بھی کلام کیا، اسی طرح فقہ، قواعد، مذاہب، تفسیر اور واقعات کا جو سرمایہ ان کے پاس تھا ان کا تجزیہ کیا اور چیزوں کے درمیان مختلف نوع کے ربط و تعلق کا انکشاف کیا۔ وہ زمانہ سپر ڈال دینے والی ذہنیت سے ابھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ یہ صورت حال دور تقلید کے ظہور تک باقی رہی تھی۔ اس وقت تک یہ بات تقریباً بدیہی سمجھی جاتی تھی کہ اسلام کی آمد کا مقصد ہی علمی، تجرباتی اور برہانی ذہنیت کی تعمیر و تشکیل ہے جو یہ تسلیم کرتی ہو کہ قلب کو یقین کی، عقل کو اطمینان کی، نفس کو آسودگی کی، انسان کو صلاح کی، اور زندگی کو تمدن و آبادی کی ضرورت ہے۔ اسلام ایسی ذہنیت کو پروان چڑھاتا ہے جو نہ صرف یہ کہ ان ضرورتوں کو تسلیم کرے بلکہ ان ضرورتوں کی آواز پر لبیک کہے اور ان کی تکمیل کے لئے عمل پیرا ہو۔ "لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل" تاکہ رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت قائم نہ ہوسکے۔

جب اسلام پسند ماہرین اور علماء علم، جانکاری، معروضیت، غیر جانبداری اور اسلامی اخلاق کی پابندی کے ساتھ اس دور کے مسائل کا تجزیہ کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں گے تو دوسرے لوگ در آئیں گے اور اسلام کی خدمت کے بجائے اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کریں گے۔ چنانچہ ان کا کام شرعی حقائق کے انکار، تشکیک اور تخریب کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ یہ صرف اندیشہ ہائے دور دراز کی بات نہیں ہے عملاً ایسا ہو بھی چکا ہے۔ استشراقی سرمائے نے مسلمان ذہنوں میں بڑے ہی خطرناک آثار چھوڑے ہیں ایسے مکاتبِ فکر کو وجود بخشا ہے جن کو نظرانداز کرنا دشوار ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔

دوسرا پہلو: تقلیدی ذہن کے حامل گروہ کے اندر جو تکوینی نقائص پائے جاتے ہیں ان کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پوری کی پوری جماعت موجودہ مغربی ثقافت سے نابلد ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بالکل ابتدائی امور سے بھی یکسر ناآشنا ہے حد تو یہ ہے کہ اس کو جاننے کی ضرورت ہے اس کا احساس بھی نہیں ہے جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ مغربی ثقافت کی بالادستی ہر جگہ قائم ہے پوری دنیا اس کی لپیٹ میں آچکی ہے۔ سولھویں صدی سے اس کے علمی سرمائے میں اضافہ شروع ہوا ہے جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ہر شعبے میں

معلومات کا انبار لگا ہوا ہے۔ ہر میدان میں اس کا چشمہ رواں ہے لیکن اسے بدقسمتی نہیں کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا۔ یہ روایت پرست طبقہ جان بوجھ کر اس عظیم علمی سرمائے سے اپنے آپ کو نابلد رکھے ہوا ہے۔ اس پر اسے اصرار بھی ہے یہاں تک کہ نئی اسلامی یونیورسٹیاں بھی اس عظیم سرمائے کو لائق اعتنا، نہیں گردانتیں، اور اس علمی ورثہ کو اس طبقہ کی طرف منتقل کرنے کا اہتمام نہیں کرتی ہیں کُل نہ سہی بعض اہم پہلوؤں کی منتقلی کی فکر دکاوش کی جاتی، لیکن اسکی طرف بھی کوئی دھیان نہیں، مثال کے طور پر سماجی اور انسانی علوم اور ان کے مناہج کے ترجمہ و نقل کا کام ضرور ہونا چاہیے تھا لیکن ان کے بارے میں بھی عام طور سے سرد مہری ہے۔ ہاں بعض جامعات میں آغاز ہوا ہے لیکن ترجمہ اور منتقلی کا کام بالکل ابتدائی مرحلے میں ہے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے، جن لوگوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے انھیں توفیق ارزانی فرمائے اچھا نمونہ سامنے لائے جو دوسروں کے لیے لائق اقتداء ہو۔

حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر کے لائق اسے بنانے کا کام اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک علمی سرمائے، اسلامی تاریخ اور ماضی کے مطالعے کا کام پورا نہیں ہوتا، ماضی کے ذخیرے سے انتخاب کا کام بالکل اٹکل پچو نہیں ہونا چاہیے کہ پہلے سے ہمارے ذہنوں میں جو صورتیں جاگزیں ہیں بس اس سے ہم آہنگ کوئی چیز نظر آئی اور ہم نے اسے اچک لیا اور اس کو بہترین لباس پہنا دیا، اس بنیاد پر بھی انتخاب کا کام نہیں ہونا چاہیے کہ اس سرے سے نظر انداز کر دیا جائے تاکہ یا تو فنا ہو جائے یا کسی دوسری چیز میں ضم ہو کر اپنا وجود ختم کر ڈالے بلکہ انتخاب کا کام اس بنیاد پر ہونا چاہیے کہ اس کا تجزیہ کیا جائے، اس کے تکوینی عناصر کا سراغ لگایا جائے۔ اس کے پس منظر کی نقاب کشائی کی جائے، تکوینی عناصر کے نتائج کا پتہ لگایا جائے، یہ بھی معلوم کیا جائے کہ تکوینی عناصر کے یہی نتائج کیوں برآمد ہوئے؟ دوسرے نتائج کیوں نہیں نکلے، ان عناصر اور فکر و آگہی کے سرچشموں یعنی کتاب و سنت اور سیرت نبوی کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے۔ اس لئے کہ انسانی ذہن جس فکری اور تہذیبی سانچے میں پروان چڑھتا ہے اس سے الگ تھلگ ہو کر وہ ایجاد و تحقیق کا کام کر ہی نہیں سکتا ہے۔

اس روایت پرست طبقہ کے اندر یہ شعور اور احساس عام کرنے کی ضرورت ہے کہ

ایک ان پڑھ اور جاہل آدمی نہ اجتہاد کر سکتا ہے اور نہ کوئی نئی چیز اپنی قوم کو دے سکتا ہے کسی ہوش مند انسان کو ایک اُمّی اور جاہل سے اس قسم کی توقع رکھنی بھی نہیں چاہیئے ۔ موجودہ زمانے میں جو شخص کسی ایک ہی ثقافت کی شُدبُد رکھتا ہے وہ بھی ان پڑھ اور جاہل ہی کی تعریف میں آتا ہے ۔ اس طرح کے شعور و احساس عام کرنے سے روایت پرست طبقہ کی صلاحیتوں کو اپنے موافق بنانے اور اسے اپنے قضیے کا موثر کردار بنانے میں بڑی مدد ملے گی ۔

(ھ) سطحیت اور پیوندکاری والے رجحانات اور کاوشیں :

قرآن پاک میں بنی نوع انسان کو خطاب کرتے وقت ان کی ذہنی سطح کی پوری پوری رعایت کی گئی ہے ۔ مقاصدِ قرآن کے ادراک اور اس کی تشریعات کی آسانی کے اعتبار سے قرآن سہل اور آسان ہونے میں اپنی مثال آپ ہے ' اسی کے ساتھ ساتھ قرآن وصفِ اعجاز کا بھی حامل ہے ۔

"ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر[۱]"

"ہم نے نصیحت کے لئے اس قرآن کو آسان بنا دیا ہے ، پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا ۔"

قرآن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زندہ جاوید معجزہ ہے ۔ انسان خواہ کسی زمانے کا ہو یا کہیں کا باشندہ ہو قرآن کے جیسا لانے سے قاصر ہے ۔ خود قرآن نے تمام بنی نوع انسان کو ان الفاظ میں چیلنج کیا ہے :

"قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا[۲]"

" اے رسول آپ کہہ دیجئے کہ سارے انسان اور سارے جن مل کر

---

[۱] سورۃ قمر آیت : ۱۷ [۲] سورۃ اسراء، آیت : ۸۸

اس قرآن جیسا لانا چاہیں تو اس جیسا نہیں لا سکتے، اگرچہ اُن میں کا بعض بعض کے لئے مددگار ہی کیوں نہ ہو۔"

زیر بحث قضیہ اپنے سرچشمہ اور مقصد کے اعتبار سے قرآنی ہے، اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ ہر فکر کا منبع اور ہر تہذیب آگہی، عمرانیات، اور تمدنی وجود کا سرچشمہ وحی الٰہی یعنی قرآن پاک کو قرار دیا جائے، قرآن کی تفسیر و بیان اور قرآن ہی پر مبنی ہونے کے اعتبار سے سنتِ رسول کو بھی مصدر ثانی ہونے کے اعتبار سے اختیار کیا جائے، لہٰذا زیر بحث قضیہ میں پیش کردہ افکار وخیالات اور مضامین کو آسان اور سہل ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ عوام اور اُمت کے بڑے طبقے کو نظر انداز کر کے صرف منتخب اور چیدہ افراد ہی کی سطح سے خطاب کیا جائے اور نہ ایسا ہو کہ ان افکار وخیالات کا تعلق صرف اعلیٰ سطح کے لوگوں کے ساتھ ہو اور جمہور اُمت اس سے محروم رہ جائے بلکہ برابر اس کی فکر و کاوش ہونی چاہیئے کہ زیر بحث قضیہ سے متعلق افکار وخیالات اور مضامین آسان سے آسان تر ہوں تاکہ بآسانی ان کی رسائی عوام الناس تک ہو سکے، اس مقصد کے حصول کے لئے بہت سارے وسائل ہیں ضرورت صرف ان کا شعور پیدا کرنے اور اچھے ڈھنگ سے ان کو برتنے کی ہے۔

قرآن مجید اور سنت مطہرہ میں ان وسائل کے تعارف میں ان گنت نمونے ملتے ہیں آسان اسلوب میں بیان کرنا ایک تربیتی عمل ہے۔ چنانچہ ایک مسئلہ کو جسے الجھا کر اور پیچیدہ بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے اسی مسئلہ کو نہایت سہل اور آسان انداز بیان کے ذریعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے اس طرح کہ اس کے تمام پہلو قابل فہم ہوں، ایک ناواقف اور معمولی پڑھا لکھا شخص بھی اس کو سمجھ لے اور اس کے جملہ آثار ونتائج کا ادراک کرلے اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ مسئلہ کو آسان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ مثالوں اور نمونوں کے ذریعہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا تسہیل اس کا نام ہے کہ کسی مسئلہ کو پھیلا کر بیان کیا جائے، نیز ذہن نشین کرنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ مثالیں دی جائیں دلائل دیئے جائیں اسی کے ساتھ اس مسئلہ کے جملہ عناصر اور اس کی وسعتوں کی پوری

پابندی کی جائے کسی عنصر کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے' تسہیل کے سلسلے میں ہماری اس تشریح سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ تسہیل سطحی بنانے سے الگ ایک دوسری شئی کا نام ہے اس لئے کہ سطحی بنانا یا سطحیت پیدا کرنا ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی چیز کا تعارف اس کے مظاہر اور خارجی سطح سے کرایا جاتا ہے اور اسی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ سطحی موضوع وہ ہے جو کسی بھی چیز کو سطحی طور سے پیش کرتا ہے اسکے تکوینی عناصر اور بنیادی نتائج کو نظرانداز کرتے ہوئے صرف خارجی مظاہر کی تصویر کشی پر اکتفا کرتا ہے' اس طرح اس چیز کے بارے میں کوئی کامل تصویر پیش نہیں کرتا جس کی مدد سے اس چیز کی جانکاری ممکن ہو یا اس میں غور و فکر کر کے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا آسان ہو، اس طرح وہ جاہلانہ ثقافت کا انبار لگانے کی خدمت انجام دیتا ہے۔

سطحی بنانے کے اپنے کچھ وسائل ہیں' اندیشہ ہے کہ ان میں اور تسہیل کی کاوشوں میں کہیں اشتباہ نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے دونوں کے مابین فرق و امتیاز کرنا ضروری ہے۔ تسہیل کا کام اختصار کے ذریعہ بھی لیا جا سکتا ہے لیکن ہر اختصار تسہیل کہلانے کے لائق نہیں ہوتا، کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اختصار کے نتیجے میں بنیادی عناصر احاطۂ تحریر میں آنے سے رہ جاتے ہیں اس طرح تسہیل کا مقصد تو حاصل نہیں ہوتا، البتہ عبارت سطحیت کا شکار ہو جاتی ہے۔

پسماندگی اور درماندگی کے دور میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اصل مضمون سے زیادہ اس کے ظاہری ٹیپ ٹاپ کا اہتمام کرتا ہے اور یہیں سے سطحیت در آتی ہے کبھی جلد نتائج برآمد کرنے، اور جلد سے جلد لوگوں کی تائید حاصل کرنے کی حرص میں سطحیت ظہور پذیر ہوتی ہے کیونکہ آدمی جلد بازی کے چکر میں پڑ کر ضروری مقدمات کی تکمیل میں کوتاہی کرتا ہے اور استحکام پیدا کئے بغیر منصۂ شہود پر لے آتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ عوامل ہیں جن سے سطحیت ظہور میں آتی ہے۔

اس موقع پر یہ وضاحت مفید ہو سکتی ہے کہ قرآن اس لحاظ سے آسان ہے کہ اس نے فہم و تفکیر کے وسائل و ذرائع کھول کھول کر بیان کئے ہیں۔ تکرار کی مدد سے اس کی مشق کرائی ہے اور نفس اور کائنات کے دائرے میں کثرت سے مثالیں دی ہیں

لیکن نتائج برآمد کرنے، تمدنی وجود پر قادر بنانے والے حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے وسائل کو استعمال کرنے کا کام اتنا آسان نہیں ہے' اس کے واسطے بہرحال تدبر و تفکر کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کسی چیز کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کے لئے اس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ ناگزیر ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ قرآن کے آسان ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ مختلف زمانوں کے مختلف ذہنوں کے لئے قرآن سے استفادہ آسان ہے بایں معنی کہ قرآن کا خطاب آسان ہے اس کا سمجھنا سہل ہے اس کے خطاب کا رُخ جمہور امت کی طرف ہے۔ ان پڑھ لوگوں کی جانب ہے۔

هو الذی بعث فی الأمیین رسولاً منهم یتلو علیهم آیاته۔[1]

"وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود ان ہی میں سے اٹھایا جو انھیں اس کی آیات سُناتا ہے۔"

تاکہ انھیں اوپر اٹھایا جائے اور ان کا تزکیہ کیا جائے' لیکن اس کے باوجود ایک چیدہ اور منتخب گروہ کی ضرورت بہرحال باقی رہتی ہے۔ کشف احوال اور استنباط احکام کے لئے جن کے سپرد مختلف امور کئے جائیں۔

ولو ردوه إلى الرسول وإلى اولى الامر منهم لعلمه الذين یستنبطونه منهم۔[2]

"اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں ہر سطح کی عقل کے لئے اس کی سیرابی کا سامان موجود ہے۔ دو قسم کے لوگ ہیں جن سے اہم فکری قضایا کو سطحی مسائل میں تبدیل کرنے کا اندیشہ ہے۔

---

[1] سورہ جمعہ آیت: ۲ [2] سورۂ نساء آیت: ۸۳

پہلی قسم: پہلی قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو دراصل ان فکری قضایا کے مخالف ہیں جنھیں اسلامی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ فطری بات ہے کہ انسان جس چیز سے ناآشنا ہوتا ہے اس کا مخالف ہوتا ہے۔ اس میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کی ذہنی نشوونما کسی ایسی تہذیب و آگہی میں ہوئی ہو جو اسلام کے خلاف بغض و عداوت کے جذبات پر مبنی ہے ایسے لوگوں کی سعی و کاوش یہ ہوتی ہے کہ فکری قضایا کو زیادہ سے زیادہ سطحی بنا کر پیش کریں۔ اس کے پس پردہ یہ مقصد کارفرما ہوتا ہے کہ ان افکار و خیالات کے حاملین اور داعیوں کو بے وقوف اور فکر و دانش سے عاری قرار دیں اور لوگوں کے سامنے اس قضیہ کی عدم افادیت ثابت کریں، اس طرح لوگوں کی دلچسپی از خود کم ہو جائے گی اور عوام اسے نظر انداز کر دیں گے۔ یہاں پر ہم بطور مثال چند مضامین کا حوالہ دیں گے جس میں اس اہم قضیے کو سطحی بنا کر پیش کرنے کی سعی نامشکور کی گئی ہے اور یہ دکھانے کی جسارت کی گئی ہے کہ اسلام انسانی علوم و معارف سے یکسر خالی ہے۔ چند برس قبل قاہرہ سے شائع ہونیوالے اخبار "الأھرام" نے ایک مضمون شائع کیا جس کی سرخی لگائی" لك الله يا علوم الانسان " "اے انسانی علوم بس خدا ہی تیرا مالک ہے" سرخی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مضمون کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کیا گل کھلائے گئے ہوں گے؟ سعودی عرب کے مرکزی شہر ریاض سے نکلنے والے پرچہ" اليمامه "کے بعض شماروں میں اس کے جوابات دیے گئے۔ "مصر" ہی کے ایک اخبار میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کی سرخی لگائی گئی، "هوجة اسمها إسلامية المعرفة" "حماقت جسے علم و آگہی کو اسلامیانے کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم دانش گاہوں میں موجود پروفیسر صاحبان اسلام کے نام سے بدکتے ہیں اور جب بھی کسی اسلامی قضیہ پر قلم اٹھاتے ہیں اس پر کیچڑ اچھالنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے افراد کی سعی نامشکور کو ناکام بنانے اور ان کی کاوشوں کے خلاف بند باندھنے کی صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ مسئلہ کو علمی اور معروضی انداز میں اور اس کی جملہ وسعتوں کے ساتھ امت کے سامنے پیش کیا جائے یہ بتایا جائے کہ بہت سے بحرانوں کا

صحیح ادراک کرلینا ہی ان کے حل کا ضامن ہے اس کے لئے بکثرت مثالیں، نمونے پیش کئے جائیں جن سے اس قضیے کی ضرورت کا احساس گہرا اور دیرپا ہو۔ ان مثالوں کے تحت ایسی تحقیقات اور ایسے مضامین شائع کئے جائیں جو دنیائے اسلام کے اندر موجود فکری و تہذیبی بحران اور نمو و ترقی کے بحران کے درمیان ربط پیدا کر سکیں۔ اسی طرح ہر نوع کی پسماندگی کے بحران اور فکری و تہذیبی بحران کے درمیان جوڑ نکال سکیں۔ اسی طرح مخالفین کی جانب سے جو فکری مضامین شائع ہوتے ہیں جن میں اسلام، اُمت کے عدل اجتماعی، اس کی تہذیبی میراث، امت کی ناکامی اور اس کے اسباب کا بیان ہوتا ہے حالانکہ ان مضامین کا اسلام اور اسلام کے عدل اجتماعی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا ہے ایسے مضامین کا ناقدانہ جائزہ لینا چاہیئے۔ معروضی اور متنوع اسلوب میں ان کا جواب دینا چاہیئے اس مقصد کے لئے مختلف اہل قلم کی خدمات حاصل کی جائیں اور متنوع وسائل استعمال میں لائے جائیں، مذکورہ بالا تدبیریں زیر بحث قضیہ کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے اور اس کے سلسلے میں لوگوں کا اعتماد پختہ کرنے میں بڑی معین و مددگار ہوسکتی ہیں۔

دوسری قسم: یہ قسم ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو زیر بحث قضیہ کو بالکل سیدھے سادے اور سطحی طور پر سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ کسی چیز کے اسلامی ہونے کے لئے بس اتنی بات کافی ہے کہ اس کا پیش کرنے والا مسلمان ہے اور وہ ظاہری اسلامی دائرہ میں ہے ایسے افراد کو کسی علمی یا تمدنی موضوع پر کسی سیکولر شخص کا مقالہ پسند آسکتا ہے اس کے خیال میں مقالے کے اندر استعمال ہونے والے الفاظ اور اصطلاحوں میں تھوڑا سا ردوبدل کردیا جائے مثلاً قومی اور عوامی کی جگہ اسلامی لکھدیا جائے تو مقالہ سو فیصدی اسلامی بن جائے گا۔

اسلامیانے کے عمل کو فروغ دینے کے لئے معاشرتی اور نظام تعلیم پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے اس طبقہ کے نزدیک اسلامیانے کا آسان اور شارٹ کٹ راستہ یہ ہے کہ کوئی دائرہ یا کوئی شعار متعین کرلیا جائے اس پر عمل درآمد کو سمجھ لیا جائے کہ اسلامیانے کا عمل انجام پاگیا، یہ طبقہ ایک چیز اور دوسری چیز کے مابین کا فکری ور فلسفیانہ ربط و تعلق سے یکسر ناآشنا ہوتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ فکری اور تہذیبی قضایا میں انسانی ذہن کی تشکیل اور انسانی ذہن کے فکری اور تہذیبی عناصر کا

کیا اثر ہوتا ہے وہ مختلف مفاہیم کے مزاج کو نہیں سمجھتا کہ ان مفاہیم کے عناصر تکوینی کیا ہیں' انسانی ذہنوں میں ان مفاہیم کو کیسے انڈیلا جاتا ہے اور انسانی ذہنوں سے کس طرح ان کو مٹایا جاتا ہے۔ اس جہل و بے خبری کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اس خوش فہمی میں گرفتار رہتا ہے کہ وہ دین کی خدمت انجام دے رہا ہے جبکہ صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ اس کی بے خبری اور نادانی کے سبب دین کے کاز کو نقصان پہنچ رہا ہوتا ہے۔

یہ مرض دو پہلوؤں سے لاحق ہوتا ہے۔ ایک روایت پرستی اور درماندگی کی وجہ سے دوسرے علمی و فکری خلاء کے سبب' مختلف اسباب و محرکات کی بنا پر یہ طبقہ ہر خیال اور ہر فکر کو لپک کر اختیار کرتا ہے پھر اسے مختصر کر کے کچھ شکلوں' بیانوں اور الفاظ میں اسے ڈھال لیتا ہے' قضیہ کے اصل روح رواں جو لوگ ہیں ان کی نیابت کا منصب سنبھال لیتا ہے۔ مسئلہ کی تفہیم و تشریح اس انداز سے کرنے لگتا ہے گویا وہ جو بیان کر رہا ہے وہی اصل مسئلہ ہے۔ اس نوع کی بہت ساری مثالیں سامنے آچکی ہیں کہ یہ طبقہ اصل مسئلہ کی کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے اس کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتا ہے۔

کسی واضح فکری بنیاد کے بغیر جو لچر اور رطب و یابس تحریریں سامنے آتی ہیں ان پر نظر رکھنا اور ان کے لکھنے والوں میں سے جن کے حُسنِ نیت کا گمان ہو ان سے رابطہ قائم کرنا مفید ہو سکتا ہے۔ مسئلہ کے فروغ اور اس کی نشر و اشاعت' قضیہ سے متعلق تحریری کاوشوں کے واسطے ماحول بنانے میں ان سے مدد مل سکتی ہے۔ مسئلہ کی حقیقت اور اس کے دائرے کے بارے میں ان سے ان کے ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کی جا سکتی ہے اور رفتہ رفتہ ان کے بعض خیالات کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے اس طور پر کہ علم و آگہی کو اسلامیانے کے مسئلہ کے بعض لوازمات اور تقاضے ان کے سامنے پیش کیے جائیں ان کا ذہن قبول کرلے تو آگے قدم بڑھانا چاہیے' اس طرح ان کے افکار کی اصلاح بھی ہو سکے گی اور اس کے اندر پختگی بھی آئے گی مزید برآں یہ کہ اس طرح مسئلہ کی خدمت کے ضمن میں صحیح راہ پر کام کا آغاز ہو سکے گا۔

ایسے موقع پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فکری اور علمی تطبیق اور پیوند کاری کا عمل فی الجملہ اسی رجحان

پر مبنی ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مسئلہ سطحیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی حدود و وسعتیں ناپید ہو جاتی ہیں اس کے سرچشمے اور مقاصد نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ تلفیق و تطبیق کا یہ کام تین سطح پر ہو رہا ہے۔

① مغربی مراجع کے دائرے میں تلفیق (پیوند کاری)

تطبیق اور علمی تبادلہ کا کام اگر ناگزیر بھی ہو تو اس کا کوئی صحیح معیار اور پیمانہ ہونا چاہیے تطبیق کے کام میں جو اصول وضوابط اور بنیادی کلیات اہم کردار انجام دیتے ہیں ان سے گہری واقفیت ضروری ہے ان کو نظر انداز کر کے تطبیق کا جو بھی کام ہو گا وہ بڑا ہی سنگین فکری نزاکت کا حامل ہو گا وہ صرف تطبیق اور علمی تبادلے تک محدود نہیں رہے گا بلکہ تلفیق کا رنگ اختیار کرے گا۔

واضح رہے کہ تطبیق اور تلفیق (پیوند کاری) کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے۔ تلفیق کے اندر مغربی افکار و خیالات کی روشنی میں اسلام کی تفسیر و توضیح شروع ہو جاتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کا صرف وہ حصہ قابلِ قبول اور لائق انتخاب قرار پاتا ہے جو پہلے سے طے شدہ مغربی افکار سے ہم آہنگ ہو، بالفاظ دیگر اسلامی سانچے میں مغربی افکار و خیالات کو ڈھالنے کے بجائے مغربی سانچے میں اسلام کو ڈھالنے کا کام تلفیق کہلائے گا۔ اس کے برعکس تطبیق کا عمل ایک تمدنی پیمانے کا تابع ہوتا ہے لین دین یا اخذ و ترک کا سارا کام ایک فکری نظام کی روشنی میں ہوتا ہے جس کے قواعد وضوابط بھی واضح ہوتے ہیں اور اس کے پیمانے بھی معلوم و متعین ہوتے ہیں۔

اس کام کی اہمیت اور نزاکت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب ایک ایسی زبان کے مطابق جس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اسلام کے قدیم علمی سرمائے کو پڑھا ہے۔ اس کو سمجھا ہے اور اس کے تاریخی سیاق کا اسے شعور ہے اس زبان کے مطابق تغریب (مغربی قالب میں ڈھالنے) کا کام شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی نزاکت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب اسلام اور اس کے سرچشموں پر جدید مغربی مناہج کو منطبق کرنے کی کاوش شروع ہوتی ہے۔

تلفیقی مطالعے میں اگرچہ بظاہر سنجیدگی اور ضابطگی دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے اندر جو بے ضابطگی بگاڑ پنہاں ہے اس کو ظاہر و آشکارا کرنا بہت ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے نزدیک کوئی ضابطہ اور منہج سرے سے ہے ہی نہیں، اس کے پاس جو کچھ ہے وہ محض منہج کی صورت و شکل اور فریب ہے۔ منہج کی روح، جوہر اور اصول نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامی مآخذ اور مغربی مآخذ کے دائروں کے درمیان بہت سارے بنیادی تضادات ہیں جن کو پھلانگے بغیر تلفیق کی گاڑی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔

مزید برآں یہ کہ تلفیق کا یہ عمل ضابطہ و منہج کی تطبیق اور لیاقت کے بارے میں بحث و تحقیق کی کوشش نہیں کرتی، اس طرح کہ اسلامی تحقیق و مطالعے میں ایسے مناہج کو داخل کر دیتی ہے جو اس مطالعے کے مراجع اور اصول کا ثمرہ نہیں ہوتے، اسی لئے آغاز ہی میں ان کا مطالعہ مناسب نہیں ہوتا اسی طرح ایسے منہجی اصول کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جن کا علمی اور فکری تخلیق کے لئے ہونا بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اصول فقہ اور بحث و مناظرہ کے آداب و اصول وغیرہ۔

۴ قدیم مراجع کے دائرے میں تلفیق :

تلفیق کا عمل صرف مغربی مراجع کے دائرے تک محدود نہیں ہے بالفاظ دیگر اسلام کے باہر سے ہی تلفیق کا کام نہیں ہو رہا ہے بلکہ قدیم اسلامی مراجع کے دائرے میں بھی تلفیق کا یہ کام ہو رہا ہے، حالاتِ حاضرہ میں فقہ اور اس کے جدید نتائج و ثمرات کو سمجھے بغیر اور علم فروق کی جانب دھیان دیئے بغیر قدیم مآخذ کے دائرے میں تیزی سے تلفیق کا عمل ہو رہا ہے یہ تلفیقی نقطۂ نظر دراصل تقلید اور روایت پرستی ہی کی ایک قسم ہے۔ یہ نقطۂ نظر قدیم علمی سرمایہ کو تقدس کا درجہ دینے کے رجحان سے جنم لیتا ہے حالانکہ یہ قدیم علمی سرمایہ انسانی اجتہادات ہی پر مشتمل ہے جن کے اندر خطا و صواب (غلط و صحیح) دونوں کا احتمال ہے۔ یہ انسانی اجتہادات بھی اُس زمانے کے حالات

کے اعتبار سے ہیں اس وقت کے حالات کو فقہاء و مجتہدین نے اسلامی اقدار پر منطبق کیا اور نتائج فکر کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اب اس علمی سرمائے کے بارے میں فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ معصوم اور ہر قسم کی لغزش سے پاک ہے۔ اور یہ عقیدہ بنا لیا گیا ہے کہ موجودہ حالات کے پیدا شدہ مسائل کے حل کے لئے قدیم علمی سرمایہ جوں کا توں کافی ہے، منہج اور طریقۂ کار کے اعتبار سے بھی نتائج و ثمرات کے اعتبار سے بھی۔

آباء واجداد کے میراث کی طرف رجوع اگر اس مقصد کے تحت ہوتا کہ اپنے وقت کے مسائل کا انھوں نے کیسے سامنے کیا اور کس طرح اپنے مسائل کا حل تلاش کیا تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن ان کے علمی سرمایہ کی طرف رجوع کا مقصد یہ قرار دیدیا گیا ہے کہ ان کے پیش کردہ حلوں کو ہر زمانے کے لئے کافی وشافی سمجھا جائے، اس رجحان کی سطحیت اس وقت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے جب حالاتِ حاضرہ کے مسائل کا حل ان کی تحریروں اور جوابات میں نہیں ملتا، مثلاً تاریخ اور قدیم علمی سرمایہ میں اسی طرح حالاتِ حاضرہ اور مستقبل کا شعور پیدا کئے بغیر قدیم علمی ماخذ کا پڑھنا جگالی کرنے سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

۴ سطحیت پیدا کرنا:

کسی مسئلہ کو سطحی بنانے کا محرک عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ جلد سے جلد مسئلہ کا حل پیش کیا جائے، جلد حل پیش کرنے کا جذبہ نیک نیتی پر مبنی ہوتا ہے لیکن جلد بازی میں معیار برقرار نہیں رہ پاتا سطحیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مسئلہ یعنی علم و آگہی کو اسلامیانے کے مسئلے میں اس کے امکانات کہیں زیادہ ہیں کیونکہ یہ کام ہنوز ابتدائی مرحلے میں ہے اس موضوع پر ابھی بہت زیادہ بحث و مباحثہ، تبادلہ خیال اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔ منہج، آگہی اور فکر کے دائرے میں اصول سازی کا کام کرتا ہے۔ اس ضمن میں اب تک جو چیزیں سامنے آئی ہیں ان کی حیثیت چند افکار و خیالات و مبادیات اور چند قابل لحاظ باتوں کے مجموعے سے زیادہ کچھ نہیں ہے ابھی تو ان میں سے بہت ساری باتوں کو عمل کی کسوٹی پر

جا نچا بھی نہیں گیا ہے اور نہ ہی بحث و تحقیق کے ذریعہ ان کو پرکھا گیا ہے، اگرچہ اس تصور کے مطابق تھوڑی سے پیش رفت ہوئی ہے جو کافی نہیں ہے۔ اصول سازی کے میدان میں مسلسل کد و کاوش کی ہنوز ضرورت ہے تاکہ زیر بحث موضوع کے لئے قواعد سازی کا کام جلد از جلد مکمل ہو سکے، اس کے اہم اور بنیادی عناصر کا شرح و بیان دقت نظری کے ساتھ ہو جائے، اس طرح کہ کچھ جدید اضافے بھی ہوں، اسی طرح جو لوگ فکری عمل کی صلاحیت رکھتے ہیں اس میدان میں ان کی کاوشیں عیاں ہیں، وہ دنیائے اسلام میں فکری نقشہ کی حقیقت کے شعور سے بہرہ ور ہیں۔ تہذیبی میراث اور فکری مسئلہ کی صورت اور روح دونوں کا گہرا شعور رکھتے ہیں، ایسے افراد کی خدمات حاصل کی جائیں اور اس قضیہ کے بارے میں ان کو لکھنے کی زحمت دی جائے کیونکہ فکری مسائل میں اور علم و آگہی کو اسلامیانے کے ضمن میں ہمارے پاس اب تک جو مواد جمع ہوا ہے اسے کافی کہا جا سکتا ہے اور نہ آخری۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ گروہ فکر کے شرح و بیان اور اختصار کی حد پر آ کر رک جاتا ہے، اگر اس سے کچھ آگے بڑھتا ہے تو مسئلہ کے ضمن میں پیش کردہ افکار اور بالکل ابتدائی نوعیت کے ابحاث کے مابین تلفیق کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ منہج اور طریقہ کار کے سلسلے میں اسے حتمی اور مکمل قرار دیتا ہے، پھر انتہائی بے چینی کے ساتھ سوال کرتا ہے نتائج کہاں ہیں اور ان کا ظہور کب ہوگا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ سطحی بنانے کا جو نازک اور خطرناک کام شروع کیا گیا تھا یہ صورتِ حال اسی کا ایک حصہ ہے، اگرچہ یہ گروہ نیک نیتی سے یہ کام کرتا ہے اور اس خواہش کے تحت کرتا ہے کہ جلد سے جلد اس خیال کی نشر و اشاعت ہو اور زیر بحث قضیہ پہ کتابوں اور تحقیقات کی وافر مقدار مارکٹ میں آجاتے مگر فکر اور علم و آگہی کے قضیہ کا تقاضا ہے کہ صرف کمیت ہی پر نظر نہ رہے بلکہ کمیت اور کیفیت کے درمیان توازن برقرار رہے اور پورے توازن کے ساتھ فکری اور تحقیقی کاوشیں سامنے آئیں بلکہ اُن پر زیادہ زور ہو کہ جو چیز بھی سامنے آئے وہ کیفیت کے لحاظ سے امتیازی وصف کی حامل ہو، بالخصوص ایسی فضا میں جس میں تلفیق کے لئے کوشاں دھاروں کی فراوانی ہے، خواہ وہ دھارے موروثی تلفیق کے حامی ہوں یا مغربی

افکار و خیالات کی تلفیق کے داعی ہوں ان حالات میں ایسے باصلاحیت اور صاحب استعداد افراد کی تلاش و جستجو نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے جو ان میدانوں میں ممتاز فکری اور تہذیبی معلومات فراہم کرنے پر قادر ہوں تاکہ ان کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں افکار کو نکھارا جائے، پلاننگ اور اسکیموں کو عمل کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور قضیہ کے لئے قواعد و ضوابط تیار کئے جائیں، علم و آگہی کو اسلامیانے کے سلسلے میں ابتداء میں جو نتائج فکر سامنے آئیں ان کے بارے میں یہ شعور پیدا کیا جائے کہ یہ تجرباتی دور کے نتائج ہیں ان میں حذف و اضافہ اور پوری سنجیدگی کے ساتھ نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ یہ کام بھی منضبط منہجی معیاروں کے مطابق ہونا چاہیئے جس میں ایک طرف تو شریعت کے اصول و قواعد اور اس کے بنیادی مقاصد سے پوری رہنمائی حاصل کی گئی ہو تو دوسری طرف حالات حاضرہ کے سامنے سپر انداز ہوئے اور اس کا دباؤ قبول کئے بغیر اس کے تقاضوں کی رعایت کی گئی ہو اور اس کی عطا کردہ سہولتوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہو۔

فکر اور علم و آگہی کو اسلامیانے کے مناہج کی اصلاح کے قضیے پر اگر بھرپور محنت کی گئی اور مذکورہ بالا شعور کے ساتھ تسلسل کے ساتھ کام کیا گیا تو اس قضیے کی بدولت تہذیب، آگہی، فکر اور تمدن کے میدانوں میں نمایاں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

قضیہ کو سطحی بنانے کے لئے جو حلقے بھی سرگرم ہیں خواہ وہ اندرون سے تعلق رکھتے ہوں یا بیرون سے ان پر نظر رکھ کر اور ان کا جائزہ لے کر یہ قضیہ مضبوط بنیادوں پر اپنی عمارت تعمیر کر سکتا ہے جس پر حقیقی شعور اور عطائے جدید کی چھاپ ہوگی۔

(و) جمہور اور عوام الناس:

اُمت کے بعض تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ افراد راہ گیر اور عام آدمی کو ناقص اور نااہل سمجھتے ہیں انھیں اس لائق نہیں سمجھتے کہ کسی فکری یا تہذیبی مسئلہ میں انھیں مخاطب بنایا جائے انکے نزدیک ایک راہ گیر اور عام آدمی کی ذہنی سطح اس سے فروتر ہوتی ہے۔ وہ تو صرف چند محدود قسم کے خطاب ہی کو سمجھ سکتا ہے جن کو اہل دانش اور تعلیم یافتہ افراد اپنی گرفت میں نہیں لاسکتے

اس انداز فکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیشتر جماعتیں اپنے فکری اور تہذیبی خطاب میں عوام کو سرے سے نظر انداز کر دیتی ہیں۔ بعض دوسری جماعتوں کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ شرح و بسط کے ساتھ مسئلہ پیش کرنے کے بجائے مختصر کر دیتی ہیں اور کوڈ الفاظ میں عوام کے سامنے پیش کرتی ہیں یا کوڈ ہی کی طرح مختصر الفاظ استعمال کرتی ہیں جنکی حیثیت رموز و اشارات سے زیادہ نہیں ہوتی، عمومی خطاب سے محروم کر دینے کا نتیجہ ہے کہ تمام مسلم ممالک میں راہ گیر اور عوام کا تہذیبی و فکری مرتبہ روز بروز پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہر جگہ جہالت، ناخواندگی اور کہیں کہیں نیم خواندگی کا دور دورہ ہے اوہام و خرافات اور شعبدہ بازی کا عام چلن ہو گیا ہے۔ یہ سب عقل انسانی کو معطل کر دینے، اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے اور روایت پرستی کے نتائج و ثمرات ہیں، جب صورت حال یہ بن جائے کہ امت کے علماء اور اہل دانش اجتہاد پر قدغن لگا کر اور روایت پرستی کو اپنا کر عوامی ذہنیت کی سطح پر آ گئے ہوں تو بیچارے عوام کی ذہنی سطح کہاں جا کے رکے گی؟ اور کس قسم کی عقلیت و ذہنیت کے وہ حامل ہوں گے؟ یہی وجہ ہے کہ عوام اور نیم خواندہ لوگ فکر کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ثقافت کا مذاق اڑاتے ہیں اس کی اہمیت کم کرتے ہیں۔ فکر و ثقافت کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ یہ ایک طرح سے تعیش ہے۔ خوشحال طبقہ اور تعیش پسندوں کو اس میں حصہ لینا چاہیئے۔ محنت کش طبقہ کو یہ چیزیں زیب نہیں دیتی ہیں، محنت کش طبقہ میں سے اگر کوئی سر پھرا ادھر کا رُخ کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ نہ کسی خطاب کا رُخ اس کی طرف ہے اور نہ کوئی خطاب اس کے لئے قابل فہم ہے کیونکہ اہل دانش نے محنت کش طبقہ کو اپنی شمار میں رکھا ہی نہیں ہے اور نہ اپنے خطاب میں ان کی کوئی رعایت کر رکھی ہے اس طرح فکری قیادت اور عوام میں کوئی ربط نہیں رہ گیا ہے بلکہ دونوں کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے۔

شرعی احکام کا مکلف بنانے کا جو مفہوم ہے اور اس کی جو بنیاد ہے اس سے پوری غفلت برتی گئی ہے۔ اسی طرح قرآنی خطاب کے مزاج اور اس کی رہنمائیوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ قرآن کریم تو تمام بنی نوع انسان کے لئے خطاب ہے اس میں کسی بھی طبقہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ غفلت شعاروں کے لئے خطاب ہے کہ وہ چوکنا ہو جائیں گم گشتہ راہوں کے لئے خطاب ہے کہ راہ یاب ہو جائیں، کافروں کو خطاب ہے کہ وہ ایمان لے آئیں،

ناخواندہ لوگوں کو خطاب ہے کہ وہ تعلیم یافتہ بن جائیں، منافقین کو خطاب ہے کہ مخلص بن جائیں منہ موڑ لینے والوں کو خطاب ہے کہ وہ نصیحت حاصل کریں اور تفکر و تدبر سے کام لیں، بینائی سے محروم لوگوں کو خطاب ہے وہ چشم دل سے دیکھیں، سرگرداں لوگوں کو خطاب ہے کہ راہِ راست اختیار کرلیں اہل ایمان کو خطاب ہے کہ وہ اپنی ایمانی کیفیات میں اضافہ کریں غرض قرآن نے اپنے خطاب میں کسی بھی طبقے کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ایک عامی اور ناخواندہ انسان مذکورہ بالا طبقات سے باہر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مکلف بنانے اور قرآن کا مخاطب ہونے کے لئے کوئی علمی یا ثقافتی معیار مقرر نہیں کیا ہے کہ جس کی ثقافت کی سطح یہ ہو جس کا علمی معیار یہ ہو یا جس کے پاس یونی ورسٹی کی فلاں ڈگری ہو وہی شرعی احکام کا مکلف یا خدائی خطاب کا مخاطب ہو سکتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا خطاب ہر ایک کے لئے ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ انسان ہو، بالغ ہو اور ہوش و حواس رکھتا ہو۔

شریعت محمدی کا امتیازی وصف ہی امی ہونا قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے

هو الذی بعث فی الامیین رسولا۔[1]

" وہی ہے جس نے امیوں میں ایک رسول بھیجا۔"

قرآن کا خطاب ذکر و نصیحت کے لئے آسان ہے۔ ہر انسان کی قدرت میں ہے اس کو سمجھے خواہ اس کی ثقافت کیسی ہی کیوں نہ ہو، اسلام کی من جملہ دیگر اہم خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت اور نمایاں ترین پہچان قرآن کے خطاب کا عام اور آسان ہوتا ہے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جمعہ کا خطبہ جس مقصد کے لئے شروع کیا گیا ہے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ اس میں جو خطاب ہوتا ہے وہ عوامی ذہن و سطح سے مشکل ہوتا ہے اور عوامی ثقافت میں شرکت سے قاصر و درماندہ ہوتا ہے۔ یہی حال مساجد میں دیئے جانیوالے درس قرآن اور درس حدیث اور دوسرے عنوان سے دیئے جانے والے درسوں کا ہے۔ دیگر اسلامی موقعوں پر بھی یہی ہوتا ہے حالانکہ ان چیزوں کا اور یہاں تک کہ اجتماعی عبادات

---

[1] سورہ جمعہ آیت : ۲

کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقات آپس میں گھلیں ملیں معاشرتی روابط کا فطری عمل شروع ہو، اگر مذکورہ بالا اسلامی موقعوں سے صحیح کام لیا جاتا تو ایسا ہونا ناممکن نہ تھا بدقسمتی سے عقلوں کو معطل کر دیا گیا ہے غور وفکر اور اجتہاد کو حرام کر دیا گیا ہے تو اس کا اثر خود خطاب کے منہج اور طریقۂ کار پر بھی پڑا ہے، اور اجتماعی ناخواندگی کی شکل میں اس کا نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ بالخصوص ایسے وقت میں جس میں عوام ہی کے اندر تبدیلی لانا مقصود ہے، ان ہی کو مثقف بنانا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعہ جو روزانہ خطاب نشر ہوتا ہے اور مزدوروں اور کاشتکاروں کے عنوان سے جو تقریریں نشر کی جاتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کا مقصد فکری رجحانات کے خلاف بند باندھنا ہے، پھر ان کو اپنے ذہن سے اپنی تاریخ اور اپنے قدیم علمی سرمائے سے الگ تھلگ کر دینا ہے حالانکہ اگر فکری رجحانات پر بندش نہ لگائی جائے تو ان ہی فکری رجحانات کے سہارے وہ اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں اور اپنی پریشانی دور کر سکتے ہیں۔ ہمیں تسلیم ہے کہ چند افراد کی عقل ہی صحیح رہنما اور حقیقی مرکز ہے جہاں سے جمہور امت میں حرکت ونشاط اور زندگی پیدا کی جا سکتی ہے لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ منتخب افراد کا عوام سے رشتہ کٹ چکا ہے اور وہ عوام تک اپنی بات پہنچانے اور عوام کی سطح سے بات کرنے سے عاجز ودرماندہ ہیں۔ اسی لئے ہمیں نظر آتا ہے کہ فکر وثقافت کے قضیہ جس سے عوام اور ناخواندہ مستثنیٰ قرار دیئے جاتے ہیں یہ قضیے اپنے ہی حصار میں بند ہوتے ہیں اور اپنی فکر کو امت سے الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ غالباً سب سے مشکل کام جس کا حل تلاش کرنا ضروری ہے کہ خطاب کو سہل اور آسان بنانے پر قدرت حاصل ہوتا کہ ہر طبقے کے لئے اس کا فہم وادراک آسان ہو، اور ایسی زبان میں ہو جسے مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعہ نشر کرنا ممکن ہو، یہ ممکن ہے کہ

فکری بحران اور قضایا کے تمام پہلو مختلف اسلوب میں مسلمانوں کے سامنے پیش کئے جائیں، ہاں مخاطب کے لحاظ سے اس کا معیار مختلف ہو سکتا ہے اس کے نتیجے میں عام مسلمانوں میں ثقافت کی بنیاد پڑے گی، اس کی بنیادی چیزوں اور ثقافت میں تعلیم یافتہ اور ناخواندہ برابر ہوں گے۔

مثال کے طور پر ایک اہم قضیہ قضا و قدر اور جبر و اختیار کا ہے اسی کے تحت انسان کی آزادی اس کے فعل و عمل اس کی عزت و شرف اور اس کے مقام اور مسئلہ قدر کے مابین جو تعلق ہے سبب و مسبب میں جو تعلق ہے اسی طرح وہ سارے ہی امور جن کے کرنے کا انسان کو مکلف بنایا گیا ہے ان کے اور مسئلہ قدر کے درمیان کیا تعلق ہے؟ پھر مسئلہ قدر سے متعلق جو غلط خیالات راہ پا گئے ہیں ان کی اصلاح کا قضیہ ہے۔ قرآن کریم جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جن وانس سب کو چیلنج کیا کہ نظم، اسلوب اور بلاغت میں قرآن کے مثل لا کر دکھائیں اسی نے فہم و تدبر اور تفقہ کے لئے قرآن کو آسان کر دیا ہے۔

كلا نمد هٰؤلاء و هٰؤلاء من عطاء ربك و ما كان عطاء ربك محظورا[1]

"ان کو بھی اور اُن کو بھی دونوں فریقوں کو تمہارے رب کے عطیے میں سے دیئے جا رہے ہیں اور تیرے رب کی عطاء کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔

غالباً قرآن کے اعجاز کے اسباب میں سے ایک اہم سبب قرار دیا گیا ہے کہ ایک طرف وہ فہم و تدبر کے اعتبار سے سہل و آسان ہے تو دوسری طرف اس کے اسلوب کی پیروی ناممکن ہے"۔ اور شاید قرآنی اعجاز کا ایک اہم ترین مظہر یہ ہے کہ قرآن بہ یک وقت تمام انسانوں کو یکساں خطاب کرتا ہے لیکن ہر شخص اسے اپنی صلاحیتوں کے مطابق سمجھتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہر شخص کو اس کی ذہنی سطح اور

---

[1] سورۂ اسراء آیت : ۲

علمی استعداد کے بقدر ہی حصہ ملتا ہے۔

فکری قائدین کا یہ عذر قابل تسلیم نہیں ہے کہ چونکہ ان کے مخاطب منتخب اور چیدہ لوگ ہیں اس لئے انھوں نے خطاب عام کو پیچیدہ بنایا ہے۔ یہ درست ہے کہ منتخب اور چیدہ افراد سے خطاب ان کے معیار سے ہونا چاہیئے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہوسکتے کہ منتخب افراد کو خطاب کرلینا کافی ہے۔ جمہور امت کو خطاب کرنے کی ضرورت ختم ہوگئی، ایک کا خطاب دوسرے کے خطاب سے بے نیاز نہیں کرسکتا ہے اور ہر ایک کا خطاب اس کی سطح اور معیار سے سودمند ہوگا۔ اگر لوگ خطاب کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرنے لگیں یا سرے سے نہ سمجھیں تو اس کی ذمہ داری فکری قائدین پر عائد ہوگی نہ کہ عام اُمت پر کیونکہ خطاب کا بہترین وصف یہ قرار دیا گیا ہے کہ مخاطب لوگوں میں سے ہر شخص اپنی ذہنی سطح کے مطابق یکساں طور سے سمجھ لے، لہٰذا خطاب کو موثر و مفید بنانے کے لئے اس کے انداز اور اسلوب میں تبدیلی لانے کے لئے مسلسل سعی و کاوش درکار ہے۔ بار بار نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے علمی ذرائع سے اس کی افادیت معلوم کرنا چاہیئے، اس طرح خطاب کے بحران اور دشواریوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اب تک صرف سربرآوردہ اور منتخب و مثقف افراد ہی کو خطاب کرنے کی جو روش رہی ہے اس میں تبدیلی لانا ازبس ضروری ہے۔

اسلامی فکر اور تہذیبی شعور کے مخالفین اس صورتِ حال سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیں گے جمہور اُمت اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے خطاب کے درمیان رخنہ اندازی کی سعی و کاوش کریں گے، راہگیروں اور عوام الناس کو اس کے خلاف ورغلائیں گے، ان کی دعوت کے خلاف پروپگینڈہ کریں گے اور لوگوں کو باور کرائیں گے کہ لوگوں کو ان کے مسائل اور ان کی مشکلات کا حل تلاش کرنے سے باز رکھنے اور لوگوں کا رُخ موڑنے کی غرض سے یہ مسئلہ کھڑا کیا گیا ہے۔ اس موقع پر یہ یاددہانی نامناسب نہ ہوگی کہ فکر اسلامی کے ضمن میں خطاب کرتے وقت لوگوں کے ذہن و دماغ میں یہ بات ڈالی جائے کہ لوگوں کے مسائل اور ان کی مشکلات کا حل فکر کی اصلاح، اس کی تجدید اور اسلامی نظام تعلیم کی تعمیر سے وابستہ ہے اس مقصد کے لئے ایسے عملی نمونے پیش کئے جائیں جنھیں دیکھ کر لوگوں کو اسلام کے فکری نقطۂ نظر کی افادیت کا یقین ہوجائے، یہ بھی اندازہ ہوجائے کہ فکر اسلامی کی اصلاح کے داعی جمہور کے مصالح و مفادات کو نظر انداز نہیں کریں گے

بلکہ اسلام کی فکری، تہذیبی اور تمدنی بنیادوں پر ان کے مسائل ومشکلات کا حل تلاش کرنے کی پوری صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور اس سے انھیں دلچسپی اور لگاؤ بھی ہے۔ اگر اداروں میں اخلاص آجائے عقل مسلم اجتہاد میں مصروف ہو جائے، پیہم عمل شروع ہو جائے، اہل فکر ودانش عوام سے مزید قریب ہوں اور عوام کی مشکلات وافکار اور ان کے مسائل سے دلچسپی لینے لگیں تو ان شاء اللہ العزیز کچھ مشکل نہیں ہے، سارے مراحل آسانی سے طے ہو جائیں گے۔

یہاں ان اسباب کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جن کی وجہ سے اُمت کی تعمیر میں فکر وثقافت اپنا کردار ادا کرنے میں پیچھے رہی، اور سربرآوردہ افراد کا خطاب اُمت کے حالاتِ حاضرہ کا احاطہ کرنے سے قاصر رہا، یہ دراصل اس ناموافق ماحول کا نتیجہ ہے جس میں جمہور کی پرورش وپرداخت ہوئی ہے۔

① مثقف اور تعلیم یافتہ افراد کے معاشرتی مقام کا رو بہ انحطاط ہونا اور مال واقتدار جیسی دیگر اقدار کا فروغ پانا۔

② اقربا، نوازی یعنی علم، مہارت، اور ثقافت سے آراستہ افراد پر اہل تعلق کو ترجیح دینا خواہ ان کا علم اور ان کی ثقافت کتنی ہی ناقص اور ادھوری کیوں نہ ہو، اقربا نوازی کا اثر یہ پڑا ہے کہ عوام علم اور اہل علم دونوں سے برگشتہ ہو گئے ہیں۔

③ اہل علم اور اہل دانش کا حق بات کہنے سے گریز کرنا اور بزدلی دکھانا جس کی وجہ سے ان کی تقریروں پر لوگوں کو مطلق اعتماد نہیں ہوتا۔

④ مثقف اور تعلیم یافتہ افراد کے مقابلہ میں تاجر، صنعت کار اور مزدور کی مادی یافت کا زیادہ ہونا بالخصوص ایسے وقت میں جب زرہی کی بنیاد پر انسان کی قدر وقیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہو۔

⑤ افکار وخیالات کے بجائے اشیاء وافراد کی قدر افزائی، یہ دراصل پسماندگی، ناخواندگی اور مختلف سطح پر اُمت کے جاہل قیادتوں سے دوچار ہونے کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

(ز) ذیلی معرکہ:

جو لوگ فکری قضیہ کو اس کی صحیح دستوں کے ساتھ ان کی جگہوں پر واپس لانے کی

اہمیت اور نزاکت سے آگاہ ہیں وہ بہت سے ایسے قضایا اور مشکلات چھیڑنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا مقصد ہی کاوشوں اور انسانی طاقتوں کو ذیلی معرکوں اور دفاعی پوزیشنوں میں الجھا دینا ہوتا ہے یا یہ کوشش ہوتی ہے کہ مقصد کو غلط ٹھہرانے اور اس کی اہمیت وافادیت کو کم دکھانے میں جملہ وسائل استعمال ہوں، ان مقصد کے تحت فکری قضیہ کے داعیوں پر طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں ان کے بارے میں کبھی کہا جاتا ہے کہ وہ تعیش پسند ہیں ان کے اندر ڈھیلا پن ہے، یہ صرف نظریاتی فکر کے داعی ہیں جو عملی نہیں ہے کبھی ان پر معتزلی ہونے، نص سے گریز کرنے اور عقل کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کا الزام لگایا جاتا ہے، کبھی ان پر شریعت کی خلاف ورزی کرنے اور نصوص کی پابندی نہ کرنے کی تہمت لگائی جاتی ہے کبھی ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اُمت کے جفاکش فرزندوں کو اُمت کے بنیادی اور اہم مسائل سے باز رکھنے کے لئے سارا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے الزامات ان پر لگائے جاتے ہیں جن کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ان کو مصنوعی معرکوں میں الجھا دیں، یہی ذیلی اور مصنوعی معرکے ان کی توجہ اور مصروفیت کا مرکز بن جائے، ان کے پاس جو تھوڑی اور محدود قوت وصلاحیت ہے وہ دفاعی کارروائیوں کی نذر ہو جائے، اصل مسئلہ کی جانب توجہ کرنے کا ان کو موقع ہی نہ ملے۔

بعض سادہ لوح افراد اور نیک طبیعت لوگ نصوص میں اصول ومبادی واقدار اور اس فکری وتہذیبی مسئلہ کے درمیان فرق کرنے سے عاجز ہوتے ہیں جن کا پایا جانا نصوص کو زمانے پر منطبق کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے ان کا خیال ہے کہ کتاب وسنت میں پوری کفایت واستغنا ہے۔ یعنی کتاب وسنت میں وارد نصوص کے بعد پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن انھیں پتہ نہیں کہ موجودہ حالات اور پروگراموں پر اس استغنا کو کیسے منطبق کیا جائے کہ کاروانِ زندگی کے اندر نظم ونسق پیدا ہو جائے، چنانچہ ان میں سے بعض لوگ مختلف اسباب کے تحت فکری اور تہذیبی دھارے کے لئے مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ایسی رکاوٹیں سامنے آجاتی ہیں جن کو دور کرنے میں بہت ساری صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ ذیلی معرکوں کی ایک مشکل یہ بھی ہے۔ یہ ایسا خندق ہے جس میں گرنے کا خطرہ

ہر وقت لاحق رہتا ہے۔ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور خوض کی ضرورت ہے تاکہ ایسے افراد نے اُمت کو جو یہ باور کرا رکھا ہے کہ بحران کی فکری تشخیص غلط ہے یا اسکی کوئی افادیت نہیں ہے اس پر روک لگائی جائے تاکہ غفلت کا پردہ مزید دبیز نہ ہو جائے فکری مسئلہ نظرانداز نہ کر دیا جائے۔ بحرانی زندگی کی عادت نہ پڑ جائے اور وقتی معرکوں ہی میں اس کی ساری صلاحیتیں ضائع نہ ہو جائیں۔ ان ذیلی معرکوں اور ان کے چھیڑنے والوں سے بالکلیہ صرف نظر کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے بلکہ بوقت ضرورت ان کے اسباب و محرکات کی نقاب کشائی بھی ضروری ہے تاکہ ان کے اثرات دور کئے جاسکیں البتہ یہ احتیاط ضروری ہے کہ آدمی ان ہی معرکوں میں منہمک ہو کر نہ رہ جائے، دفاعی پوزیشن کو مثبت عمل میں تبدیل کر کے فکری بحران کی مزید وضاحت کی جائے اور اس کے حل کی ضرورت پر زور دیا جائے بحث و مباحثہ اور بات چیت کا دائرہ وسیع کر کے اس کے لئے نئے میدان اور نئی راہیں تلاش کی جائیں۔

اس نوع کے جو جھگڑے کھڑے کئے جاتے ہیں ان سے استفادہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف یہ کہ قضیہ کی وضاحت کی جائے بلکہ اس کا صحیح حل پیش کیا جائے اور اچھے انداز میں اپنا نقطۂ نظر عوام کے سامنے لے آیا جائے، اسی طرح دوسروں کی فکری و تہذیبی غلطیوں کو بیان کیا جائے ان کی جانب سے پیش کردہ نظریات اور حل پر نقد کیا جائے، ان کی کمزوریاں نمایاں کی جائیں تاکہ لوگ موازنہ کر کے دیکھ سکیں کہ دوسروں کی جانب سے پیش کردہ حل و نظریات اور فکر اسلامی کے پیش کردہ حلوں کے درمیان کتنا واضح فرق ہے؟ اس کا ایک افادی پہلو یہ بھی ہے کہ فکر اسلامی پر ہونے والے حملوں کو فکر اسلامی کے حق میں استعمال کیا جا سکے گا اور حملہ کرنے والے افراد کو پسپا کیا جا سکے گا اس کا دوسرا افادی پہلو یہ ہے کہ سنجیدہ اور مخلصانہ تنقید اور خودغرضی پر مبنی تنقید کے مابین فرق کیا جا سکے گا۔ کسی جماعت یا گروہ کی مخالفت ہمیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ ان کی تنقید اور رائے زنی میں جو مفید عنصر ہے اس سے ہم فائدہ نہ اٹھائیں اسی طرح مخالفین کی جانب سے آئے دن جو مسئلے چھیڑے جاتے ہیں ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسئلہ پر اور اپنے کام پر ضرور نظر ثانی کرنی چاہیے اور جہاں اصلاح کی ضرورت

محسوس ہو وہاں بلا تاخیر اصلاح کرنی چاہیے یوں ہم شر میں خیر کا پہلو نکال سکتے ہیں۔

(ح) ریسرچ و تحقیق کے حلقے :

تحقیقاتی ادارے یا اکیڈمک دائرے سے ہماری مراد عالم اسلام میں پلنے جانے والے بحث و تحقیق کے مراکز، معاہد اور یونی ورسیٹیاں ہیں موجودہ شکل میں یہ سارے ہی ادارے ہماری راہ کے سنگ گراں ثابت ہو رہے ہیں اپنے مقاصد کے اعتبار سے بھی اور سرچشمہ اور منبع کے لحاظ سے بھی جو ان کی تاسیس کے پس پردہ ملحوظ اور کارفرما ہوئے ہیں۔ ان تحقیقاتی اداروں کے کام کے لئے جو موضوع منتخب کئے جاتے ہیں ان کے اعتبار سے بھی وہ ہماری راہ کا روڑا ہیں بحث و تحقیق کے طریقہ کار اور ان کے لئے مہیا وسائل کے لحاظ سے بھی رکاوٹ ہیں اس کے ساتھ ان کے اندر قدرت و صلاحیت بننے کی پوری استعداد موجود ہے۔ یعنی بیک وقت ان کے اندر مسئلہ اور مسئلے کا حل دونوں بننے کی پوری صلاحیت پائی جاتی ہے کیونکہ یورپ کی یونی ورسیٹیاں مغربی افکار کی تخلیق ان کی سرپرستی اور تصحیح، مغربی تہذیب کے نظام کی تعمیر و تقویت، معاشرتی مسائل کے یہ ادراک ان کا حل پیش کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ اس طرح یہ یونی ورسیٹیاں بیک وقت دو میدانوں میں خدمت انجام دے رہی ہیں یعنی ایک طرف فکر و ثقافت کو وجود میں لانے کا کام کر رہی ہیں تو دوسری طرف قوم تک اس فکر و ثقافت کے پہچانے کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ اس طرح قوم سے ان یونیورسیٹیوں کا ربط و تعلق قائم بھی ہے اور واضح بھی یوں یہ یونی ورسیٹیاں معاشرتی تاثیر و اثر پذیری اور قوم کی تہذیبی تشکیل دونوں کاموں کی نگرانی و سرپرستی کر رہی ہیں۔ مغربی افکار و نظام کے حامل تحقیقاتی اداروں کو جوں کا توں اگر دنیائے اسلام میں منتقل کر دیا جائے، اس طرح کہ ان کا طریقہ کار مغربی رہے اغراض و مقاصد مغربی رہیں اور مغربی سرچشموں سے ان کا رشتہ بدستور استوار رہے تو اس سے دنیائے اسلام کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ بلکہ خود یہ ادارے دنیائے اسلام کے لئے ایک سنگین مسئلہ بن جائیں گے۔ ان اداروں کے دنیائے اسلام میں منتقلی کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ شکل اور مضمون دونوں میں مغربی افکار اور مغربی تہذیب کی غلامی کا دور دورہ ہو جائے گا۔

دنیائے اسلام کے حالات کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اکیڈمک یا تحقیقاتی اداروں میں بڑی وسعت آئی ہے۔ یونی ورسٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اسکول اور کالج جہاں سے طلبہ کی شکل میں یونی ورسٹیوں کو غذا ملتی ہے ان کی تعداد میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے اس کے باوجود اسلامی علوم کی تعلیم و تحقیق کا کام بد ترین صورت حال سے دوچار ہے۔ عام حالت یہی ہے کہ ان کے ذریعہ مسئلے کے حل کی جو شکل سامنے آرہی ہے اس کے مقابلے میں ان کے مضر اثرات زیادہ مرتب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو اسلامیانے ہی کا میدان دیکھئے۔ مغربی طرز پر قائم شدہ اسکول، کالج اور یونی ورسٹیاں جو نظریۂ تعلیم اپناتی ہیں اس میں وحی الٰہی کو بطور علم و آگہی کا منبع و سرچشمہ اختیار کرنے کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا ہے۔ ان کی نظر میں وحی الٰہی اور ان سے پھوٹنے والے علم و آگہی کے سوتوں کی حیثیت خرافات سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر انھوں نے کچھ زیادہ وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا تو یہ کہدیں گی کہ وحی الٰہی اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی آگہی آگہی تو ہے لیکن غیر علمی اور غیر سائنٹفک ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نوجوانوں کی بھاری اکثریت انحراف کا شکار ہو گئی ہے۔ نبوت، نبوت کی عطیات اور کسی بھی انسان کی ذہانت و عبقریت کے معیار سے نبوت کو جوڑنے کے بارے ان کا اعتقاد کمزور ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ اسلامی تعلیم سے بدکنے لگے ہیں اور ان سے بھاگنے لگے ہیں کم سے کم نقصان یہ ہوا ہے کہ نبوت کا مفہوم ان کیلئے انتشار و پراگندگی کا شکار ہو گیا ہے۔ یہی حال دین اور دین کے دوسرے قضایا اور مسائل کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحقیقی اداروں، مراکز، اور یونی ورسٹیوں کو ان کی موجودہ شکل میں باقی رکھتے ہوئے ہم ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ ان کو صلاحیت و امکانات میں بھی ہم نہیں بدل سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے بہاؤ اور دھارے کو مغربی نظام سے موڑ کر اسلامی نظام کی سمت میں کر سکتے ہیں جب تک ہم مسئلہ کے اسباب کا دقت نظری کے ساتھ پتہ نہ لگائیں اور بالکل صحیح نہج پر اور مکمل غیر جانبداری کے ساتھ ان اسباب کے تدارک کی فکر نہ کریں اور مسلم ذہن کو جو بدقسمتی سے صرف نتائج و آثار کے علاج میں منہمک ہے اس سے نجات دلا کر علاج کے صحیح مقام یعنی اسباب کے تدارک پر نہ لگا دیں۔

اکیڈمک دائرے یا تحقیقاتی ادارے جو سنگ گراں اور رکاوٹ بننے کے بجائے مسئلہ کا

حل اور اس کا وسیلہ بن سکتے تھے لیکن ایسا کیوں نہ ہو سکا؟ اس کے چند اہم اسباب یہ ہیں:

(۱) زمانہ کہاں سے کہاں جا پہنچا، لیکن تہذیبی ادارے اور اسلامی اکیڈمیاں بدستور اپنی پرانی روش پر قائم ہیں ان کے طریقہ کار میں تبدیلی آئی ہے اور نہ وسائل و ذرائع میں اور نہ موضوعات کے انتخاب میں اس طرح یہ ادارے میوزیم کی صورت اختیار کر چکے ہیں جن کی صرف تاریخی قدر وقیمت باقی رہ گئی ہے۔ کیونکہ اس وقت یہ ادارے زمانے اور اس کے حقیقی مسائل سے باہر زندگی گذار رہے ہیں۔ بے فیض اور بے کار دائرے میں چکر کاٹ رہے ہیں، شرح، تلخیص اور تلخیص کے سوا ان کا کوئی کام نہیں رہ گیا ہے۔

(۲) معاشرہ اور اس کے مسائل و قضایا سے ان اداروں کا رابطہ بالکلیہ ختم ہو جانا۔

(۳) زمانہ، زمانے کی تبدیلیوں اور اس کے مسائل سے ان اداروں کا بے تعلق ہو جانا۔

(۴) مغربی تہذیب کی بالادستی، اس کے ترقی یافتہ ہونے، بحث وتحقیق کے میدان میں اس کی سبقت اور اصول سازی پر عصری اداروں کا ایمان لے آنا، اور تہذیب فرنگ کی اندھی تقلید کرنا حقیقت یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے تحقیقی ادارے مغرب سے صرف طریقہ کار ہی درآمد نہیں کرتے بلکہ مغربی کتابیں اور اس کے کام ان اداروں کے لئے مراجع اور مصادر کا درجہ رکھتے ہیں۔ منہج، مرجع، مصدر، کتاب اور مدرس ہر سطح پر ہمارے تحقیقی ادارے مغربی اکیڈمیوں ہی کے خوشہ چیں ہیں اور ان ہی کے دائرے میں چکر کاٹتے ہیں۔

(۵) صحیح پلاننگ، تہذیبی حفاظت، مغربی تہذیب کو برتنے اور اس سے استفادے کی پہلے سے ذہنی رہنمائی کے بغیر طلبہ کی کھیپ کی کھیپ مغرب کے تحقیقی اداروں میں بھیجنا، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مبعوث حضرات کی بیشتر تعداد مغربی یونی ورسٹیوں سے مغربی افکار ورجحانات کو عالم اسلام کی جامعات میں منتقل کرنے کے لئے پل کا کام انجام دیتی ہے۔

(۶) دنیائے اسلام میں تحقیقی کام کرنے والوں اور یونی ورسٹیوں کے پروفیسروں کی بڑی تعداد کا مغربی یونی ورسٹیوں کے فارغ اور پروردہ ہونا۔

دقت نظری کے ساتھ ان اسباب کا مطالعہ اُن بنیادی امور میں شامل ہے جن کے بغیر نہ امت کے بحران کی صحیح تشخیص ہو سکتی ہے اور نہ اس کا کوئی مناسب حل تلاش کیا جا سکتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ امت کے امراض کے علاج اور امت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی غرض سے مثبت انداز میں کچھ کرنے کے بجائے اس کا قوی اندیشہ ہے کہ اُمت کو ملامت کرنے اور برا بھلا کہنے میں لوگوں کی توانائیاں ضائع ہونے لگیں۔

جہاں تک علوم نقلیہ یا علوم شرعیہ کی تعلیم کے ذمہ دار حلقوں اور ان کے وسائل کا تعلق ہے تو ان حلقوں نے اپنی ذات کو آباء و اجداد کے چھوڑے ہوئے اوقاف کی حدود میں محصور کر لیا ہے حالانکہ خود ان اوقاف کا حال یہ ہے کہ شخصی یا سرکاری قبضہ کی صورت میں خلف کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس طرح یہ اوقاف اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں اسی طرح علوم شرعیہ کے فضلا امتیازی اوصاف سے عاری ہیں۔ ان کے اندر کوئی ایسی خوبی یا امتیازی شان نظر نہیں آتی جو دوسروں کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ہو اور جسے دیکھ کر دوسروں کے اندر یہ تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ و شوق پیدا ہو، یہی حال علوم شرعیہ کی تعلیم کے طریقہ کار کا ہے جو عام طور سے تقلید اور نقالی پر مبنی ہے۔ اور آباء واجداد کی اجتہادی کاوشوں اور علمی سرمایہ کی عموماً نمائندگی کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان کی روشنی میں اجتہاد کرنے والا ذہن تیار کرنا جو اسلامی علم و آگہی کے سرچشموں سے استفادہ کرنے پر قادر ہو اور جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کے مسائل کا حل پیش کر سکے اور بگڑے ہوئے ماحول کی اصلاح کی خدمت انجام دے سکے ایسے کھلے ہوئے اور روشن ذہن کا تیار کرنا اس نظام تعلیم کی وسعت سے باہر ہے۔ ہاں اگر علوم شرعیہ سے وابستہ لوگ راہِ راست پر گامزن رہیں، ماضی میں مجتہدین نے اپنے اپنے زمانے اور حالات کے لحاظ سے جو فکری سرمایہ چھوڑا ہے صرف اسی تک محدود اور اسی سے مربوط ہونے کے بجائے اصولی اور منہجی ذہن سے استفادہ کریں تو علوم شرعیہ کا نظام تعلیم آج بھی اپنا کردار موثر طور پر انجام دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

دینی تعلیم کا حلقہ ہو یا کوئی دوسرا حلقہ امتیازی اور نادر صلاحیتوں کا ظہور خال

خال ہی نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہوتی ہے تو بعض افراد کی کاوشوں اور کاموں میں عام معیار سے بلند کوئی چیز نظر آجاتی ہے، امر واقعہ ہے کہ تعلیم کے دونوں حلقے خواہ لادینی اور مغربی فکر و تہذیب کے داعی ہوں یا علوم نقلیہ کے علم بردار، دونوں ہی حلقے تہذیب و آگہی کے بحران کی کھلی دلیل ہیں اور اس امر کا واضح ثبوت یہ ہے کہ پوری اُمت اجتماعی تقلید میں گرفتار ہے۔ دنیا کے اسٹیج سے اسلامی تہذیب غائب ہے۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی تعلیم امت کے حق میں نئے بحران کا پیش خیمہ ثابت ہو رہی ہے حالانکہ اعلیٰ تعلیم کو مسئلہ کا حل ثابت ہونا چاہیے تھا۔ ان میں سے بعض بحران نزاکت اور سنگینی کے اس مرحلے تک پہنچ گئے ہیں کہ ان کے سبب اُمت کے مختلف گروہوں کے مابین نزاع اور کشمکش شروع ہوگئی ہے۔ مغرب کے تہذیبی ماحول میں رہ کر مغرب کی درسگاہوں سے مغربی معاشرتی علوم حاصل کرنے والے اور اہل مغرب سے متاثر افراد کے درمیان اور علوم نقلیہ کے حاملین جو زمانہ اور اس کے تقاضوں سے کٹ کر رہ گئے ہیں ان کے درمیان ایک نئی کشمکش کا آغاز ہو چکا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی بھی مسئلہ ہو مسلمان ایک رائے نہیں ہو سکتے ہیں اور نہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ بعض فکری تنظیمیں اور بعض ادارے اس عام حکم سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں بس ان ہی سے ترقی کا خمیر تیار ہو سکتا ہے اور از سر نو سفر کا آغاز ہو سکتا ہے۔ البتہ ابھی اس کا میدان بہت محدود ہے۔

اس موقع پر ایک اور مسئلہ قابل توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ شرعی علوم کے حاملین کا معاشرہ کے بہت سے امتیازات سے محرومی کا مسئلہ، منجملہ اس کے دیگر اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ جدید معاشرے کے عہدوں اور مناصب سے ان کی تعلیم ہم آہنگ نہیں ہے شرعی علوم کے فارغین ان عہدوں اور منصبوں کے تقاضے پورا کرنے سے عاجز و درماندہ ہیں۔ اور چونکہ مادی یافت ہی کے حساب سے لوگ تعلیم کا انتخاب کرتے ہیں اس لئے بہت سے ذہین اور ہونہار طلبہ دینی علوم پڑھانے والے اداروں کا رُخ ہی نہیں کرتے ہیں ان کے حصے میں وہی طلبہ آتے ہیں جو نکمے اور کاہل ہوتے ہیں تعلیم و استعداد میں اپنے ہمسروں سے پیچھے ہوتے ہیں اور کم نمبر حاصل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اچھے تعلیمی اداروں اور نیک نام کالجوں میں ان کا داخلہ ممکن ہی نہیں ہوتا، مجبوراً وہ دینی اداروں کا رُخ کرتے ہیں اس عمومی

حکم سے وہ بعض غریب لیکن ذہین طلبہ مستثنیٰ ہیں جنھیں اپنے مالی حالات کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور اپنے من پسند انتخاب کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں ملتا ہے تو مجبوراً ایسے ذہین طلبہ بھی دینی اداروں کو مل جاتے ہیں ان میں سے بعض کا ستارہ چمک جاتا ہے چنانچہ ایسے افراد تقلید کے گھروندوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُمت کی تہذیبی تشکیل میں نمایاں حصہ لیتے ہیں ایک طرف یہ ہے تو دوسری طرف ان دینی اداروں کے مشرف اور نگراں زمانے کی تبدیلیوں کے ادراک سے عام طور سے نابلد ہوتے ہیں ان کی نگاہیں مستقبل کے تابناک افق کو دیکھنے سے عاجز ہوتی ہیں ان میں سے بعض افراد تو بالکل ماضی کا ایک حصہ معلوم ہوتے ہیں ہاں ان کے اندر تقلید کی بڑی اچھی صلاحیت ہوتی ہے جس طرح جانور پہلے سے کھائے ہوئے مواد کی جگالی کرتا ہے اسی طرح یہ علمی جگالی کرتے ہیں اگلوں نے جو کچھ لکھدیا ہے یا کہہ دیا ہے اس کے تکرار کے سوا کچھ نہیں کرسکتے ہیں۔ چنانچہ اسی جمود دتعطل کا نتیجہ ہے کہ بیداری اور ترقی کی کاوشوں کی قیادت کرنے والے دینی اداروں سے دستیاب نہیں ہوتے، عام طور سے یہ لوگ دینی اداروں سے باہر ملتے ہیں، اسی کے ساتھ سیاسی حالات، سیاست کے جانبدارانہ رویہ، باہر کی تہذیبی اور تعلیمی پالیسیوں سے ربط وتعلق کا بھی اضافہ کریجئے۔ جس نے اُمت کے اندر پسماندگی لانے اور بحران پیدا کرنے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام میں تہذیب وسیاست، علم وآگہی اور حکومت کے درمیان نہ ختم ہونے والی کشمکش جاری ہے اس لئے کوئی کہہ سکتا ہے کہ تحقیقی اداروں کے دائرے اُمت کی تہذیبی ضرورت پورا کرنے سے قاصر رہے ہیں اور انھوں نے کوئی قابل ذکر کردار ادا نہیں کیا ہے۔ تقریباً گذشتہ دوصدیوں سے مسلمانوں میں مغربی طرز پر سیکولر تعلیم کا نظام جاری ہے لیکن اس طویل عرصہ میں مسلمانوں نے نہ کوئی ترقی کی اور نہ ہی کسی حقیقی ترقی کا آغاز کیا اب تک وہ ایک بھی ایسا تحقیقی ادارہ قائم نہ کرسکے جس کے فارغین تفوق وندرت میں اپنے ہمسر اہل مغرب کا مقابلہ کرسکیں، اسلامی زاویۂ نگاہ سے اپنے معاشرے کے مسائل کا حل نکال سکیں اور اپنی صلاحیت اور کارکردگی کا لوہا منوا سکیں۔

عالم اسلام کی یونی ورسٹیوں اور دیگر تحقیقی اداروں کی تعلیمی پسماندگی اور گرتے

ہوئے معیار کا حل ان طریقوں سے تلاش کرنا انتہائی دشوار ہے جن ذرائع سے دیگر قومیں عام طور سے اپنے مسائل کا حل ڈھونڈتی ہیں۔ کیونکہ ہماری دشواریوں اور مشکلات کا سبب فکری زیاں اور صحیح تعلیمی نقطۂ نگاہ کا فقدان ہے۔ چنانچہ علم وآگہی کے سلسلے سے کوئی حقیقی بحث وتحقیق سامنے آہی نہیں سکتی ہے جب تک صحیح نظریہ موجود نہ ہو، ایسا تعلیمی نظریہ جو اُمّت کے عقیدہ سے ہم آہنگ اور مربوط ہو یا کم از کم اتنا تو ضرور ہو کہ اُمّت کے مسلّمہ عقائد سے ٹکراتا نہ ہو، یہ نظریہ روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے خاتمہ کے بعد کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی ہے۔

عالم اسلام میں بالعموم اور اکیڈمی حلقوں میں بالخصوص تعلیم کو مذکورہ زاویۂ نگاہ کی ضرورت ہے تعلیم کے سلسلے میں ایک مغربی شخص جس نقطۂ نظر کا حامل ہوتا ہے مسلم ممالک میں تعلیم وتربیت کے ذمہ دار اس نقطۂ نظر کے حامل نہیں ہوتے اگر اس نقطۂ نظر کے حامل ہو بھی جائیں تو اس کی بنیاد پر عالم اسلام کے ساتھ ہم آہنگی دشوار ہوگی، ایک بات اور ہے خود ان تعلیمی قیادتوں کا حال یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے عدم واقفیت ، بے تعلقی، اپنی ذاتی کاہلی اور مقصد ومحرک کے فقدان کے سبب بغیر کسی خارجی دباؤ کے از خود انھوں نے اسلامی نقطہ سے دست برداری اختیار کرلی ہے۔

عالم اسلام میں تربیتی قیادتوں کا حال بھی تعلیمی قیادتوں سے مختلف نہیں ہے۔ ابھی ہم نے جو صورتِ حال بیان کی ہے وہ اس کے عین مطابق ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین انصاف ہوگا کہ اسی صورتِ حال کا ثمرہ اور لازمی نتیجہ ہیں۔ مادیت کی جانب میلان ان کا نمایاں وصف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تربیتی قیادتیں حقیقی آگہی اور واضح مقصد سے تہی دست ہیں۔ جن مدرسین اور اساتذہ نے مغرب میں جاکر انسانی علوم (آرٹس) اور معاشرتی علوم کی تعلیم حاصل کی ہے انھوں نے اپنی تعلیم کے دوران اسلام کے فکری سرچشموں سے کوئی واسطہ نہیں رکھا ہے۔ اسی طرح اپنے فکری سفر میں اسلامی مقاصد کو سامنے نہیں رکھا ہے بلکہ حصول تعلیم سے ان کا مقصد مادی فوائد کا حصول تھا۔ یہ کوئی ایسا طاقتور محرک نہیں ہے جو طالب علم کو اس تعلیم کے حصول کے لئے محنت وجانفشانی پر آمادہ کرسکے جس تعلیم کی اُمت کو واقعتاً ضرورت ہے اس کا مقصود اور منتہائے آرزو صرف دولت یا منصب کا حصول ہے۔ مغربی دانش گاہوں

سے فارغ ہونے والے مشرقی فضلاء کے سامنے چونکہ کوئی واضح مقصد اور طاقتور محرک نہیں ہے اسی لئے یہ لوگ اپنی قوم کو کچھ دینے سے قاصر رہے، جبکہ ان ہی کے معیار کے مغربی فضلاء نے اپنی قوم کے لئے بہت کچھ کیا، کچھ دینے کی بات تو الگ رہی مغربی دانش گاہوں کے ان مشرقی فارغین سے یہ بھی نہیں ہو سکا کہ جو کچھ پڑھا تھا اس کو صحیح طور سے ہضم کرتے اور بوقت ضرورت اس کو امت کے سامنے پیش کرتے، ان سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ اسلامی علم و آگہی کو نئے انداز سے پیش کرتے جو معرفت، حقیقت، انسان اور کائنات کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر پر مبنی ہوتی۔

عالم اسلام کی تہذیبی قیادت کا ایک بڑا اہم مسئلہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ تہذیبی قیادت پورے طور پر اگرچہ ایک مغربی شخص کے نقطۂ نظر کی حامل ہے اور مغربی افکار و خیالات کے سلسلے میں کامل دستگاہ حاصل ہے۔ پھر بھی عمل کے میدان میں اسے ناکامی ہی سے دوچار ہونا پڑے گا کیونکہ جو امت مسلمہ کے معاشرتی اور تہذیبی مسائل سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی مطلقاً صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔ ان میں حیرت اور تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ حاصل کردہ علم ایک الگ چیز ہے اور تہذیب جو علم کو سنوارتی ہے اور علم کو مقاصد کی خدمت کے لائق بناتی ہے اور علم کو راہ راست پر گامزن رکھتی ہے وہ بالکل دوسری چیز ہے اس لئے کوئی ایسا ذریعہ ہونا ناگزیر ہے جس کے توسط سے مغربی اداروں اور مغربی نہج پر تربیت حاصل کرنے والے حلقوں تک اسلامی نقطۂ نظر کی رسائی ہو سکے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام کے بہت سے طلبہ علم میں اپنے ہمجولیوں سے فائق ہوتے ہیں لیکن تہذیبی تہی دستی اور اسلامی نقطۂ نظر کے فقدان کے آثار ان پر نمایاں نظر آتے ہیں کیونکہ جب تک اسلامی نقطۂ نظر سے علم و آگہی کی اصول سازی کا کام نہ ہو گا، اس وقت تک تہذیب اور اس کے ثمرات برآمد نہیں ہوں گے۔ بیشتر فارغین صرف ڈگری کے حصول کو کافی سمجھتے ہیں تاکہ اسے لیکر جلد سے جلد وطن واپس ہو جائیں اور اس کی مدد سے کسی معاشرتی مرکز میں ملازم ہو جائیں اور کوئی مناسب تنخواہ مل جائے رہی مضامین اور طریقہ کار کی بات جو اس وقت عالم اسلام کی یونی ورسٹیوں میں رائج ہیں تو اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں کہ یہ بعینہ وہی مضامین ہیں جو مغرب کی جامعات میں رائج ہیں اس میں کسی قسم کی

کوئی تبدیلی نہیں کی گئی منہج اور طریقۂ کار بھی مغربی یونی ورسٹیوں کا ہے۔ البتہ ہماری یونی ورسٹیاں اس نقطۂ نظر سے عاری ہیں جو عالم اسلام کے لئے موزوں ہو سکتا ہے کیونکہ مغربی نقطۂ نظر عالم اسلام میں سو فیصدی کامیاب نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے ہماری جامعات میں جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ ناقص ہی نہیں بلکہ ضرر رساں بھی ہے کیونکہ یہ تعلیم مسلم طلبہ کا رشتہ اپنی اصل اور بنیاد سے کاٹ دے گی۔ اپنے تمدن سے بے تعلق کر دے گی اور اپنی شناخت سے محروم کر دے گی اس تعلیم سے یہ توقع بے جا ہو گی کہ وہ اُمت کو پسماندگی کے دلدل سے نکلنے پر قادر بنائے گی حالانکہ ان اداروں کو اپنے مضامین اور طریقۂ کار کے ساتھ مغرب سے مشرق کی جانب منتقل کرنے کے جواز میں یہی دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان اداروں کے ذریعہ ہم پسماندگی کے دلدل سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اکیڈمی حلقوں یا تحقیقی اداروں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان اداروں میں ایسے اساتذہ کی بے حد کمی ہے جو اسلامی نقطۂ نگاہ کے دشمن نہ ہوں جبکہ ان کے بارے میں مطلوب یہ ہے کہ وہ اسلامی نقطۂ نگاہ، اور اسلامی علمی حس کے حامل ہوں۔

مسلمان طالب علم جس وقت اعلیٰ تعلیمی مرحلہ کا آغاز کرتا ہے اس وقت اس کے پاس اسلامی تعلیمات کی مقدار تھوڑی ہوتی ہے موقع ملا تو گھر پر تھوڑی بہت اسلامی تعلیم حاصل کر لی یا تعلیم کے ابتدائی مرحلے میں کچھ معلومات اسے حاصل ہو گئیں اگر کوئی بہت زیادہ خوش نصیب ہے تو اسے گھر اور اسکول دونوں جگہ اسلامی تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل گیا، لیکن اتنی بات بالکل واضح ہے کہ اسلامی تعلیم کی اس تھوڑی سی مقدار سے نہ اسلامی فکر تشکیل پا سکتی ہے اور نہ اسلامی نقطۂ نظر بن سکتا ہے اور نہ اس مقدار سے اسلام کی طرف انتساب ہی اتنا پختہ ہو سکے گا جو باہر کی دنیا سے متاثر ہونے کی راہ میں حائل ہو سکے۔ اس طرح جب مسلمان طالب علم اپنی تعلیم کا اعلیٰ مرحلہ شروع کرتا ہے تو ایک طرف وہ اسلامی فکر اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے خالی ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کا ذہن کسی بھی بیرونی اثر کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار ہوتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تعلیم کے آغاز کے وقت طالب علم کے اندرون میں کچھ اسلامی احساسات اور جذبات ہوتے ہیں لیکن اس کے سامنے نہ واضح مقاصد ہوتے ہیں اور نہ اس کے اپنے احساسات و جذبات کے لئے ٹھوس بنیادیں ہوتی ہیں جن سے اسلامی نقطۂ نگاہ کی

تشکیل ہوتی ہے۔ احساسات اگر پائے بھی جائیں تو ان نام نہاد معروضی احکام، حقائق اور افکار کے سامنے نہیں ٹک سکتے، جن کو معاشرتی اور انسانی شعبے پیش کرتے ہیں جن کو طالب علم خالص مغربی نہج پر پڑھتا ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ بیچارے اس طالب علم کے پاس نہ فکری حفاظت کا کوئی سامان ہوتا ہے اور نہ دفاع کے وسائل، اور نہ ہی اس کے نزدیک وہ نقطۂ نظر ہوتا ہے جس کے سہارے اس قسم کے تصور کا مقابلہ کر سکے، مغرب کے فکری دھارے سے حفاظت کے لئے ایسے طالب علم کے پاس زندہ اسلامی عقیدہ کا کچھ حصّہ، خواہ وہ کتنا ہی کم ہو یقینی طور پر ہونا چاہیئے جو درپیش مشکلات سے متعلق بہترین سرچشموں اور بنیادوں پر مبنی ہو۔

فکری سطح پر عالم اسلام کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنیوالے طالب علم کو ایسے مغربی عقائد اور مغربی فلسفوں کا سامنا ہوتا ہے جو پوری تیاری، ہوشیاری اور دلائل کے ساتھ اس کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ان افکار و دلائل پر یا تو نقد ہوتا ہی نہیں ہے اگر نقد ہوتا ہے تو انتہائی کمزور اور پھسپھسے دلائل کے ساتھ۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ عالم اسلام میں اب تک کوئی اکیڈمی یا تحقیقی ادارہ وجود میں نہیں آیا ہے جہاں اسلامی فکر اور اسلامی نقطۂ نظر کی مکمل تعلیم دی جاتی ہو جس طرح مغرب کے ہائی اسکولوں میں مغربی افکار اور مغربی نقطۂ نظر کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یعنی باہم ربط و تعلق ہوتا ہے۔ سنجیدگی ہوتی ہے، وسعت و ہمہ گیری ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام جہتوں سے اس کی پوری پوری پابندی کی جاتی ہے بالفاظ دیگر عالم اسلام کے تحقیقی اداروں کے طالب علم کی ذہنی و فکری تشکیل اسلامی تہذیب اور اسلامی تربیت کی روشنی میں نہیں ہو پاتی ہے۔

اس لئے تعلیمی نظام کی از سرنو تشکیل کے وقت ذاتی یا شخصی تنقید کو ایک ضروری عنصر کی حیثیت سے انگیز کرنا چاہیئے، کیونکہ تنقید تعمیر و اصلاح کا ایک اہم ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ انسانی اور معاشرتی علوم کی جڑیں اہل مغرب کے ہاتھوں کافی مضبوط ہو گئی ہیں ان میں نکھار اور پختگی آ گئی ہے اور یہ بھی ناقابلِ تردید ایک حقیقت ہے کہ مختلف اسباب کی بنا پر انسانی و معاشرتی علوم کا رشتہ مسلمانوں سے کٹ چکا ہے۔

آج جبکہ ہم اسلامی تعلیم و ثقافت کی تشکیل جدید کے لئے کوشاں ہیں ضروری ہے کہ

ہمارے اندر نقالی سے زیادہ ہضم وتجزیہ کی صلاحیت ہو، معاشرتی علوم اور معاشرتی علوم کے میدان میں اہل مغرب کی جو فکری کاوشیں سامنے آئی ہیں انکو ہم اسلامی اقدار کے دائرے میں ہضم کریں اور ان کے طریقۂ کار کو معلوم کریں کیونکہ ان علوم کو ہضم کئے بغیر اور لوگوں کی زندگی پر اسلام کو منطبق کئے بغیر صرف موروثی کاوشوں ہی کو ترقی دینے کی فکر میں لگے رہے تو ہماری مثال اس شخص سے مختلف نہ ہوگی جو سمندر میں ہل چلانے کی سعی لاحاصل کر رہا ہو۔

اس لئے اس مرحلے میں المعھد العالمی للفکر الاسلامی جیسے مخصوص فکری اداروں کی ذمہ داری یہ ہے کہ معاشرتی علوم کے اسلامی مآخذ اور بنیادوں کو متعین کریں، ان کے اغراض ومقاصد کی وضاحت کریں، جو لوگ ان علوم میں اختصاص کا درجہ رکھتے ہیں ان سے بات چیت کے ذریعہ رابطہ قائم کریں، ایسے حلقے تیار کریں جو متبادل پیش کرنے پر قادر ہوں، علوم محض وسائل وذرائع کا درجہ رکھتے ہیں اس بارے میں مشرق ومغرب کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ علم محض انسانی کمائی کی حیثیت سے باقی رہتا ہے اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ اس کے انبار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس میں علمی تبادلہ ہونا ایک ناگزیر عمل ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن سے اوجھل نہ ہو کہ علمی تبادلہ اور فکری موقف دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ لیکن علم کے سرچشمے، ان کے مقاصد اور اس کے فلسفے اُمت اور عقیدے کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا خالص علم کلام کی جدلیات سے بچتے ہوئے قرآن کی روشنی میں عقیدہ کا مطالعہ کرنے، جدید علم کلام کو وجود میں لانے اور عقیدے کو روزمرہ کے مسائل سے مربوط کرنے کی ضرورت ہے۔ جو عالمی فکری قضیوں اور مسائل سے ہم آہنگ ہو اور مقامی مسائل کے باوجود فکر کو اسلامی سطح تک بلند کر سکے۔

زیر بحث قضیہ یعنی مناہج فکر کی اصلاح اور علم وآگہی کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے لئے دراصل ایسا ہی اکیڈمی حلقہ مطلوب ہے جو تجربہ گاہ کا کام دے سکے، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ یہ حلقہ اپنی موجودہ پوزیشن میں خواہ استاذ ہو، طالب علم ہو، طریقۂ کار ہو، کتاب ہو یا ادارہ مطلوبہ مقصد کے حصول کے لئے بالکل موافق اور سازگار نہیں ہے، اگر اس حلقہ کی اصلاح پورے طور پر ہو جائے تو اسلام کے تعلیمی نظام کی تشکیل کا دروازہ کھل جائے، اس حلقہ میں تبدیلی

اور اس کی اصلاح نہایت ضروری ہے اور اسی پر دوسرے شعبوں کی اصلاح بھی مبنی ہے اس لئے فکر و آگہی کے دائرے میں اولین اور لازمی اقدام یہ ہے کہ اکیڈمی حلقوں کی اصل حقیقت کا ادراک کیا جائے اور اس کی اصلاح کے لئے صحیح راہوں کا مطالعہ کیا جائے اس کے ساتھ طرز عمل اور اس کو موجودہ پوزیشن سے منتقل کرنے کے لئے لائحہ عمل مرتب کیا جائے، صورت حال کے ادراک ہی سے براہِ راست چیلنج کا واسطہ پڑے گا۔ ایک اہم کام یہ ہے کہ امت کے مختلف طبقوں میں یہ شعور عام ہونا چاہیئے کہ امت کے فکری و تہذیبی بحران کا نچوڑ اسی حصہ میں مرکوز ہے یہ کام اس لئے بھی ضروری ہے کہ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات جاگزیں ہو چکی ہے کہ ترقی، تجدید اور نشاۃ ثانیہ کا کام اس حلقہ کے بغیر انجام نہیں پا سکے گا۔ اس غلط رجحان سے نجات حاصل کرنے کے لئے اکیڈمی حلقے کی اصلیت کے بارے میں شعور عام کرنا نہایت ضروری ہے اس حقیقت کا ادراک نہایت ضروری ہے کہ اکیڈمی حلقہ خواہ طریقۂ کار ہو یا استاذ یا طالب علم اس کی اصلاح ناگزیر ہے اس سلسلے میں بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ ان اکیڈمی حلقوں کا رُخ کیا جائے اور انہیں جو وسائل و ذرائع مہیا ہیں ان کی مدد سے جملہ صلاحیتوں کو ہر سطح پر بروئے کار لایا جائے اور بہتر سے بہتر نتائج برآمد کرنے کی سعی و تدبیر کی جائے اس ضمن میں ہماری تجاویز یہ ہیں۔

(۱) **طریقۂ کار:** یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اصول سازی، طریقۂ کار، ان کی ترقی، بحث و تفکیر کے ذرائع اور آگہی کے وسائل کی تعیین میں مسلمانوں کو سبقت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے جن منہجی اصولوں کی ترتیب و تدوین کی خدمت انجام دی ہے ان کا سکہ آج بھی رائج ہے خواہ علوم نقلیہ کا میدان ہو یا علوم عقلیہ کا، ہر جگہ ان کے وضع کردہ اصول مشعل راہ کا کام دیتے ہیں امر واقعہ ہے کہ ان کے زمانے میں جو بھی علوم رائج تھے ان میں سے ہر ایک کے اصول الگ متعین کئے، چنانچہ اصول فقہ، اصول تفسیر، اصول قراءت، اصول حدیث، اصول نحو، اصول منطق وغیرہ ہر ایک شعبے میں متعین اصول وضع کئے جن کے ذریعہ صحیح علمی نتائج برآمد کرنا آسان ہو گیا علوم نقلیہ میں انھوں نے صرف استنباطی طریقۂ کار اور منہج پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر تاریخ اور معاشرتی علوم کے میدان میں استقرائی منہج بھی پیش کیا، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصول سازی اور منہج سازی کی ذہنیت اس اُمت کی نمایاں ترین

چھاپ ہے دراصل مسلمانوں کے اندر یہ چیز قرآن مجید کی طرف سے آئی ہے اسی کے ساتھ یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ اصول سازی طریقہ کار کی تعیین اور نئے علوم کیلئے نئے مناہج وضع کرنے کا کام تھم گیا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پاس اصول کا تاریخی سرمایہ تو موجود ہے لیکن اس میں ترقی نہیں ہوئی ہے۔ جبکہ اہل مغرب کے نزدیک مناہج کے اندر زبردست تبدیلی رونما ہوئی ہے اور اس نے طویل سفر طے کرلیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہماری یونی ورسٹیاں اور ہمارے ادارے مغربی مناہج اور طریقہ کار کے زیر اثر اور تابع ہو کر رہ گئے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ ہر قوم جس کے یہاں علمی کارواں رک جائے گا فکر کو نظرانداز کردیا جائے گا اور تہذیبی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا اس کا حشر وہی ہوگا جو آج اُمت مسلمہ کا ہے۔

جب یہ تسلیم ہے کہ ہر چیز میں صحیح سوچ بچار اور صحیح علمی نتیجہ برآمد کرنے کے لئے منہج اور طریقہ کار ایک ناگزیر شئی ہے تو یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اکیڈمی حلقے میں بھی منہج اور طریقہ کار کی ضرورت ہے اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتی ہیں۔

فکری اصلاح، علمی و تہذیبی تغیرات، مسلم عالم اور مسلم تعلیم یافتہ کی ذہنی تربیت، فکر اسلامی کی اصلاح، اسلامی معاشرتی علوم کی تشکیل اور علم وآگہی کو اسلامیانے کے میدان میں جو کاوشیں ہو رہی ہیں انھیں ان مغربی تعلیمی اصول کی جانب سے زبردست چیلنج کا سامنا ہے جو اصول اکیڈمی حلقوں میں سکۂ رائج الوقت کی طرح مقبول ہیں اور جن سے سرمو انحراف جرم عظیم سمجھا جاتا ہے۔

ریسرچ اور تحقیق کے بنیادی منصوبے خواہ ان کا تعلق مغربی افکار کے مطالعے سے ہو یا موجودہ علمی تخلیقات سے ہو یا قدیم اسلامی سرمائے سے ہو، یہ سارے منصوبے لازمی مسائل ہیں ان ہی کے ذریعے طریقہ کار وضع کرنے میں مدد ملے گی اور ان ہی کی بدولت استاد و شاگرد کیلئے بنیادی علمی غذا فراہم ہوسکے گی۔ خواہ یہ کام ماضی اور موروثی سرمایہ کے سلسلے میں شعور بیدار کرکے ہو تاکہ تعلیم یافتہ مسلمان اپنے اور اپنی موروثی بنیادوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے پر قادر ہوسکے اور ماضی سے خوشہ چینی کرکے اپنے لئے ترقی کی راہیں ہموار کرسکے یا یہ کام موجودہ تہذیب و تمدن کا شعور بیدار کرکے ہو تاکہ تعلیم یافتہ مسلمان جدید علوم اور موجودہ تمدن سے بہرہ ور ہو کر ان کے

بارے میں تنقیدی موقف اختیار کر سکے، تعلیم یافتہ مسلمانوں کو فکری اور نفسیاتی آزادی سے بہرہ ور کرنے کے لئے مذکورہ بالا کام مقدمہ اور تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں، عالم اسلام کے اندر اس وقت جو فکری صورتِ حال ہے ان کا شعور ہونا بھی ضروری ہے تاکہ فکری جہتوں کا احاطہ ہو سکے اور ان میں سے جو بنیادی اور اہم جہتیں ہیں ان پر نقد و تجزیہ اور ان کی اصلاح کا کام آسان ہو سکے، مختلف انسانی علوم کے سلسلے میں اولین اور بنیادی معلومات فراہم کرنا، ان کے لئے اصول سازی اور ان کے طریقہ کار کو آزمانے اور نکھارنے کا کام اہم بھی ہے اور بلا تاخیر کرنے کا ہے۔ اس طرح معاشرتی اور انسانی علوم کے بارے میں بنیادی اور ضروری معلومات کا وافر ذخیرہ تیار ہو سکے گا۔ تحقیقی اداروں میں تجربہ کے لئے مواد فراہم ہو سکے گا۔ اور تہذیبی تبادلہ اور علم و آگہی کو اسلامیانے کے خیال کی نمائندگی ہو سکے گی۔ ان کاموں کے ساتھ ہی ساتھ بنیادی محوروں میں تخلیقات کا سلسلہ بھی جاری رہنا چاہیئے تاکہ ان کے ذریعے درج ذیل میدانوں میں فکری قضیہ کا شعور ابھر سکے اور اس مسئلہ پر غور خوض کے لئے کوئی ضابطہ بنایا جا سکے۔

- طریقہ کار
- فکر
- فکر و آگہی
- تہذیب
- تمدن
- علم
- قدیم علمی سرمایہ

اس میدان میں عالم اسلام کے ممتاز اور ذی استعداد باصلاحیت اہل قلم کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں جنھیں ایک طرف قدیم علمی سرمایہ کی وسعتوں اور ان کے اصول کے بارے میں اطمینان بخش ادراک ہو تو دوسری طرف موجودہ انسانی اور معاشرتی علوم کے مناہج کے بارے میں مہارت رکھتے ہوں ان کے تعاون سے چھوٹے چھوٹے کتابچے تیار کرائے جائیں جو تیز رفتاری کے ساتھ علمی و ثقافتی جگہوں میں گردش کر سکیں، ان کتابچوں میں مطلوبہ طریقہ کار، خیال،

منصوبہ بندی، ترجیحات، اساس و بنیاد، مقصد، وسیلہ، اور تحقیق و تفتیش کی کاروائیوں کا پورا خلاصہ اور نچوڑ آجائے۔ اس سلسلے میں طریقۂ کار اور اصول سازی سے دلچسپی رکھنے والے اداروں، انتظامیہ اور تحقیقی و تعلیمی اداروں کے اندر منصوبہ ساز کمیٹیوں سے رابطہ قائم کرنا بھی سود مند اور بار آور ہو سکتا ہے۔

(۲) استاذ: استاذ کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور قابل لحاظ ہیں۔

(الف) ایسی انسانی طاقتوں کی تیاری جو علوم پر پوری دسترس رکھتی ہوں، تہذیبی طور پر باشعور ہوں، جو ایسے علمی منصوبوں کے دائرے میں اساتذہ کے واسطے علمی فراغت کے وسائل فراہم کر سکیں جو فکر و آگہی کے مسائل کی خدمت کر سکیں اور اصول سازی اور بنیاد کی فراہمی میں تعاون کر سکیں، اور اس دائرہ میں روابط مضبوط کر سکیں۔ اچھے عناصر کے ساتھ تاثیر اور اثر پذیری کے لئے زمین ہموار کر سکیں، اُمت کے مسائل حل کرنے میں فکر کی اہمیت اجاگر کر سکیں اور فکری بحران کے سلسلے میں اچھے عناصر کی توجہ مبذول کرا سکیں۔ اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے اور علاج کے وسائل کی تلاش و جستجو پر ان کو آمادہ کر سکیں۔

(ب) ایسے گروپ کی تیاری جو بامقصد فکری، تہذیبی اور تربیتی موضوعات پر اجتماعی طور پر تحقیق و ریسرچ کی خدمت انجام دے سکے، جو عالم اسلام کے فکری و تہذیبی نقشے کی صرف پیمائش و سروے ہی نہ کرے بلکہ حسب ضرورت اس کی اصلاح کرے، مذکورہ گروپ کے اندر مطلوبہ شعور پیدا کرنا اور ان کو معاون قیادت کی حیثیت سے تیار کرنا، جنھیں اس قضیہ کی وسعتوں کا پورا علم ہو اور یہ بھی پتہ ہو کہ خلل کہاں کہاں واقع ہے۔ ساتھ ہی ساتھ صحیح فکر اور صحیح بنیاد پر امت کو اوپر اٹھانے کی اس میں پوری صلاحیت بھی ہو۔

(ج) امت کے مسائل، اس کے فکری و علمی بحران کو زیر بحث لانے اور امت کے تہذیبی ڈھانچے کی تعمیر جیسے مسائل پر غور و خوض کرنے کے لئے متنوع سمیناروں کا انعقاد اس مقصد کے لئے ایسے محوروں کی تیاری جن کے اندر قضیہ کی جملہ وسعتوں کو ابھارنے کی صلاحیت ہو، سنجیدہ عملی پروگرام پیش کرنے کی غرض سے ممتاز اہل قلم کا تعاون حاصل کرنا اس مسئلہ پر گفتگو کرنے اور اظہار رائے کے لئے دروازہ کھلا رکھنا، شرکت کے دائرہ کو وسیع کرنا، مناقشہ اور گفتگو کے

ذریعہ اساتذہ میں مسئلہ کے تئیں فکرمندی پیدا کرنا، سیمناروں میں جو اچھے مقالے پیش کئے جائیں ان کی طباعت کا اہتمام کرنا، کیونکہ ان کی مدد سے اسلام کے مطلوبہ تہذیبی ڈھانچہ کی تیاری میں مدد ملے گی۔ ذرائع ابلاغ کے تعاون سے ان کی نشرواشاعت کے کام کو فروغ دینا، ان سیمناروں کی افادیت کا مطالعہ کرتے رہنا تاکہ مستقبل میں غلطیاں واضح ہوجائیں۔ مطلوبہ معیار تک کام ہونے لگے اور متوقع مقاصد کی تکمیل ہوسکے۔

مذکورہ بالا امور کے ذریعہ علمی مصادر کی تشکیل ہوگی اور ان علمی مصادر کی بدولت معلم کا معیار بلند کرنا ممکن ہوگا۔ اور وہ اس لائق ہوسکے گا کہ وہ فکری بحران کے حل اور اسلام کے تہذیبی نظام کی استواری کے لئے بلند پایہ اور مفید افکار پیش کرسکے، کلاس روم ہو، لکچر ہال ہو یا کوئی اور علمی مقام استاذ اپنے علمی معیار سے بات کرے گا۔ ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے طلبہ کو ایسے موضوعات کے انتخاب میں صحیح رہنمائی کرسکے گا۔ یوں جدید علم کے میدان میں بہترین تحقیقی سرمایہ جمع ہوسکے گا، بالخصوص معاشرتی، انسانی اور فکری میدان میں علمی و تحقیقی پیش رفت ہوسکے گی۔

(۳) طالب علم: منہج فکر کی اصلاح اور علم و آگہی کو اسلامیانے کے قضیے کے نقطۂ نظر سے طالب علم ہی فکری نظریہ کا مستقبل اور اس کا حامی ہے۔ فکر و خیال کے سلسلے میں شعور کا میدان بھی وہی ہے اور فکر کے واسطے بنیاد فراہم کرنے کا اصل محرک بھی، فکر کی تجدید کی قابلِ اعتماد ضمانت بھی وہی ہے۔ اکیڈمک دائرے میں طالب علم منہج اور استاذ سے کبھی جدا نہیں ہوتا بلکہ وہ اس میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ طالب علم ہی تعلیمی و تربیتی عمل کا ثمرہ ہوتا ہے۔ بلکہ منہج مدرس اور کتابیں طالب علم کے لئے وسائل کا درجہ رکھتی ہیں ان کی مدد سے طالب علم کی فکری تشکیل عمل میں آتی ہے۔ موروثی و تہذیبی امور کی صفائی ہوتی ہے، اقدار پر مبنی اس کے عالم افکار کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ عصری زاویۂ نگاہ سے وہ چیزوں کو دیکھنے کے لائق بنتا ہے۔ اور لوگوں کے لئے فکری غذا فراہم کرنے پر قادر ہوتا ہے۔

اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظام تعلیم اور استاذ پر جو کاوشیں صرف ہوئی ہیں۔ ان کی حیثیت صرف وسائل و ذرائع کی ہے ان کو کام میں لاکر طالب علم کی تیاری و تشکیل ہوتی ہے

اس کو باشعور بنایا جاتا ہے اور علمی جہاد کے تسلسل کو قائم و جاری رکھنے کے لئے اس کی تربیت کی جاتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ طالب علم ہی اس قضیہ کا اصل و بنیادی کردار ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ان طالب علموں کی صلاحیتوں کو ضائع نہ ہونے دیا جائے بلکہ سرگرم اور مفید میدانوں میں ان کی صلاحیتیں لگائی جائیں، بالخصوص اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے ایم، اے، ایم فل اور پی، ایچ ڈی کرنے والے طلبہ اور نئے فارغین اہتمام و توجہ کے زیادہ مستحق ہیں، جس شعبے میں انھوں نے اختصاص کیا ہے اس میں انھیں فنی طور سے تیار کیا جائے، انھیں ترغیب دی جائے کہ انسانی علوم میں اپنی استعداد پختہ کریں، یا فکری قضایا اور آگہی کو اسلامیانے کے موضوع پر معہد کے پروگرام اور پلاننگ کے تحت ممتاز اساتذہ کی نگرانی میں مطالعہ کریں اور تحقیقی کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔

اسی طرح فکر کی اصلاح اور آگہی کو اسلامیانے کے منصوبے کے تحت جو کاوشیں ہو رہی ہیں ان ہائر ایجوکیشن کے طلبہ بنیادی اینٹ کا درجہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا جامعات سے فارغ ہونے والے بالخصوص انسانی اور معاشرتی علوم کے مختلف شعبوں میں اختصاص و مہارت پیدا کرنے والے اچھے عناصر کے انتخاب کی کاروائی بلاتاخیر شروع ہو جانی چاہیئے اور ان کو لے کر علمی ٹیم تیار کرنی چاہیئے، جسے اپنے شعبے میں مہارت حاصل ہو، یہ ٹیم اپنی بلند پایہ استعداد، علمی تفوق اور اسلامی آگہی میں دوسروں سے فائق اور ممتاز ہو، اسی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے رسالوں اور تحقیقی مقالوں کی رہنمائی بھی ہونی چاہیئے۔

(ج) وقفے وقفے سے فکری موضوعات پر جو سمینار منعقد ہوں ان میں ذہین اور ذی استعداد طلبہ اور نئے فارغین کے واسطے شرکت کو آسان بنایا جائے، سمینار کے موضوع پر کوئی اچھی بحث کرنا چاہیں تو اس کی حوصلہ افزائی ہو، ورنہ کم از کم اتنا ضرور ہو کہ وہ سمینار میں حاضر ہوں اور بحث و نقاش میں حصے لے سکیں، سمیناروں میں شرکت کی بدولت ان کی بڑی اچھی تربیت ہو سکے گی ان کی فکر کے دائرے وسیع ہوں گے۔ بات چیت اور عملی حصہ لینے کی وجہ سے ن کی خوابیدہ صلاحتیں ابھریں گی۔ اسی کے ساتھ فکری قضایا اور ان کے محوروں کے سلسلے سے اچھی جانکاری ہوگی زیر بحث لائے جانے والے مسائل کو پیش کرنے اور وضاحت

کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

(د) یونی ورسیٹیوں اور دیگر اداروں میں زیر تعلیم اور ریسرچ کرنے والے طلبہ کی رہنمائی و تربیت میں ہاتھ بٹانا چاہیے، اگر سب کی خصوصی رہنمائی ممکن نہ ہو تو ان میں ایک گروپ کا انتخاب کرلینا چاہیے اور ان پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اس طرح یونی ورسیٹیوں سے علم، اور علم والے دونوں مل سکیں گے۔ طلبہ کی رہنمائی اور تعاون کے توسط سے علم کے مقاصد، اس کے سرچشمے اور اس کے تہذیبی نتائج کے بارے میں اثر انداز ہونے کا موقع مل سکے گا۔ مناہج فکر کی اصلاح سے متعلق موضوعات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے طلبہ کو آمادہ کیا جا سکے گا۔ کام صرف رہنمائی ہی پر ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ زیر بحث موضوعات سے متعلق مآخذ سے طلبہ کو روشناس کرانا ہوگا، اچھے اور منتخب مقالوں کی نشر و اشاعت کا بندوبست کرنا ہوگا، ان ساری کاوشوں کے نتیجے میں مطلوبہ مفہوم نکھر کر سامنے آئے گا اور آگہی کو اسلامیانے کے کام کو بنیاد فراہم ہوگی۔ مذکورہ بالا کاوشوں اور تبدیلیوں کی بدولت ان شاء اللہ تعالیٰ یہ اکیڈمی یا تحقیقی حلقے فکری قضیہ کی خدمت کے لئے موثر اور سرگرم کردار ادا کرنے کا وسیلہ بن سکیں گے اور کسی مناسب وقت میں امت کے تہذیبی نظام کی تعمیر کی خدمت انجام دے سکیں گے۔

(ط) ذاتی غلطیاں:

ذاتی غلطیاں ہی غالباً وہ حقیقی خطرہ ہیں جو متعدد اسلامی موقفوں کو لاحق ہیں ان میں فکری اور تہذیبی موقف بھی ہے۔ دراصل منصوبہ بندی، نقد و تجزیہ، نظر ثانی، اور اصلاح و درستگی کا کام رک جانے ہی کے نتیجے میں بار بار غلطیاں سرزد ہوتی ہیں غلطیوں کا انبار سا لگ رہا ہے۔ اور بیرونی اثرات کو پھیلنے اور اثر انداز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ نقد و تجزیہ کے کام کو بالکلیہ روک دینے ہی کا نتیجہ ہے کہ اصلاح کی گذشتہ تحریکوں سے صحیح فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ ایسی بات نہیں کہ گذشتہ تحریکوں کو مسئلہ کا احساس نہ ہوا انھیں مسئلہ کا احساس تھا اور انھوں نے سدھار کی کوشش بھی کی، فرق صرف یہ ہے کہ جڑ اور بنیاد کی اصلاح کے بجائے شاخوں سے اصلاح کی کوشش کی گئی، اپنی ذات کو نظر انداز کر دیا گیا اور بگاڑ کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دی گئی، حالانکہ اصلاح کا یہ طریقہ قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ قرآن کا اعلان تو یہ ہے کہ:

"قل ھو من عند انفسکم"[1]

"اے نبی تم ان سے کہو یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے"۔

مناہج اور طریقۂ کار کی اصلاح کی بات ہم اسی لئے کہتے ہیں کہ مناہج کی حیثیت نشانِ راہ کی ہے اس سے ہر تحریک کو رہنمائی مل سکتی ہے۔ طریقہ کار ایک معیار اور پیمانہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ ہر مرحلے کی اصلاح ہو سکتی ہے اس لئے ہمیشہ آغاز اس نکتہ سے ہونا چاہیئے کہ ہم اس حقیقت کو صدق دل سے تسلیم کریں کہ ہماری اندرونی بیماریاں ہی ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں چنانچہ ہم لوگ جنھوں نے اس قضیہ کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ ہماری غلطیاں سب سے زیادہ ضرر رساں ہیں اور مسئلہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوں گی، اہم اور نمایاں ترین ذاتی غلطیاں جن کے دلدل میں پھنسنے کا قوی اندیشہ ہے درج ذیل ہیں۔

① فکری اور تہذیبی مسئلے کے بارے میں اُمت کے اندر ضروری شعور پیدا کرنے ضروری مراحل طے کرنے کی غرض سے بقدر ضرورت افرادی قوت تیار کرنے، یونی ورسٹیوں، اداروں، درسگاہوں کی سطح پر کامیاب تعلیمی قافلوں کے لئے ضروری مواد فراہم کرنے، جامعات، مراکز اور دیگر تعلیمی و تحقیقی اداروں میں اپنے مخصوص حلقے بنانے اور علمی انجمنیں قائم کرنے جو فکری و تہذیبی قضیہ کو اپنا سکیں، اس کو کامیاب بنانے کے لئے سرگرم عمل ہو سکیں، اسی طرح بطور ذریعہ اور وسیلہ ذرائع ابلاغ کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے مسئلہ کی نشر و اشاعت کے لئے متوازی نظم کرنے سے پہلے ہی سستی و کاہلی کا شکار ہو جانا اور کام کے تسلسل کو برقرار رکھنا۔

② نظر ثانی اور اصلاح کی کارروائیوں کا رک جانا، قافلۂ عمل پر پیہم علمی اور عملی طور پہ نقدِ ذاتی کا سلسلہ بند ہو جانا جس سے راہ راست پر واپس لانے کی ضمانت ملتی ہو۔

۳۔ "یک نظری" میں گرفتار ہو جانا یعنی اس خوش فہمی کا شکار ہو جانا کہ ہم جو افکار و نظریات پیش کر رہے ہیں بس وہی حق ہیں اس کے ذریعہ ایسا مکمل نقطۂ نظر تشکیل پا جائے گا

---

[1] سورہ آل عمران۔ آیت : ۱۶۵

جس کی مدد سے دنیا کی ہر حقیقت آشکار ہو جائے گی وہ امت کے جملہ امراض کا شافی علاج ہے اور ہر بحران کا حل ہے۔

(۴) تحزب اور گروہ بندی کے رجحانات کا عام ہو جانا، اور مرکزیت حاصل کرنے کے لئے جا و بے جا تدبیریں اختیار کرنا، یہ اتنا مہلک اور سنگین مرض ہے جو زیر بحث قضیے کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے بحران کا ایک اہم سبب اور پریشانی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اجتہادی قضایا اور فکری مکاتب کو سیاسی پارٹیوں میں تبدیل کر دینا بجائے خود ایک سنگین مسئلہ ہے اس لئے یہ بات شروع ہی میں واضح ہو جانی چاہیئے کہ گروہ بندی تفکیر کے مزاج سے بالکل میل نہیں کھاتی ہے۔ بحث ونظر کے لئے جو معروضیت اور وسعت درکار ہے اور تفکیر کے لئے جو رائے کی آزادی مطلوب ہے گروہ بندی کی صورت میں یہ چیزیں میسر نہیں آسکتی ہیں اگر کسی قضیے کے حاملین اور کارکنان میں مطلوبہ فکری وسعت نہ پائی جائے تو قضیہ مزید بحران کا شکار ہو جاتا ہے ہماری فکری تاریخ میں بحران کے نمایاں ترین اسباب میں غالباً ایک اہم سبب یہ ہے کہ فکری اور اجتہادی مذاہب سے تقلیدی مذاہب باہم دست بگریباں پارٹیوں، فرقہ وارانہ وسائل، اور سیاسی گروہوں کی روپ دھار لی جن کی قیادت کی باگ ڈور قائدین کے ہاتھوں سے نکل کر عوام اور پیرو کاروں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔

اسی کے ساتھ اس مہلک فکری مشکل کا اضافہ کر لیجئے کہ آدمی جس ادارے یا تنظیم سے تعلق رکھتا ہے اسی کے کام کو کام اور اسی کی خدمت کو خدمت گرداننے کی بیماری میں مبتلا ہو جائے اس عجب اور خود پسندی کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ لوگ اس ادارے یا تنظیم سے بعد محسوس کرنے لگتے ہیں اور اس کے فکری سرمایہ سے استفادہ نہیں کر پاتے، حالانکہ اگر لوگ اس ادارے یا تنظیم کے قریب آتے اس کے فکری اندوختہ سے فائدہ اٹھاتے تو قوی امکان تھا کہ ان سے نقطۂ نظر کو شادابی اور عقل کو غذا ملتی اور یہ لوگ مقصد کی تکمیل کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتے،

تحزب اور گروہ بندی کے محدود دائرے میں سوچ بچار کرنے سے وسیع فکری دائرے

ایک محدود گروہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مخالفین کی جانب سے حصار میں لینے سے قبل یہ گروہ خود اپنے خول میں بند ہو جاتا ہے اور اپنے ارد گرد ایک حصار قائم کر لیتا ہے۔ حالانکہ یہ گروہ اگر تحزب کی پستی سے نکل کر سوچتا اور کام کرتا تو ہم فکر، ہم مزاج اور ہم مقصد دوسرے اداروں کے لئے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ ان کے ساتھ تعاون کر سکتا تھا۔ ان کے ساتھ فکری منہجی اور عملی طور سے ہم آہنگ ہو سکتا تھا۔ باہم ربط و تعلق کے نتیجے میں ترقی و فروغ کے زیادہ مواقع ملتے۔

۵ مبادی اور مقاصد میں کسی ایک فکری ضابطہ اور مشترک نقطۂ نظر پر متفق نہ ہونا جس کی وجہ سے قضیے کا اہتمام کرنے والوں اور اس کے حاملین کی جانب سے مسئلہ کے مبادی اور اس کے مقاصد کے بارے میں بعض دفعہ ایک دوسرے سے متضاد رائیں سامنے آتی ہیں۔ یوں بات سلجھنے کے بجائے مزید الجھ جاتی ہے کسی بھی فکر کے حاملین اور داعیوں کی جانب سے مختلف اور متضاد نقطۂ نظر اور خیالات کے سامنے آنے کا مطلب یہی ہے کہ خود اس فکر کے حاملین کے نزدیک مسئلہ پوری طرح واضح نہیں ہو سکا ہے، اور وہ خود فکری ژولیدگی کے شکار ہیں۔ کسی بھی قضیے کے ذمہ داروں کے تنوع اور ان کے تہذیبی پس منظر کے اختلاف کی وجہ سے بھی منصوبہ بندی اور اجتہادی ذرائع میں تنوع اور اختلاف رونما ہوتا ہے۔ بہر حال مبادی اور مقاصد میں اختلاف کا یہ ثمرہ ضرور برآمد ہوتا ہے کہ مسئلہ کی جڑیں مضبوط ہونے سے پہلے ہی ہل جاتی ہیں۔ اس کی جیسی تبلیغ ہونی چاہیے نہیں ہو پاتی، دوسروں کے اندر اس مسئلہ کے تئیں نہ فکرمندی پیدا کرنا ممکن ہوتا ہے اور نہ تعاون کا جذبہ پیدا کرنا آسان ہوتا ہے۔ لہٰذا زیر بحث قضیہ کے اختیار کرنے والوں اور اس کے کارکنوں کی ثقافت میں خواہ کتنا ہی تنوع اور اختلاف ہو، یا ثقافت کے حصول کے ذرائع خواہ کتنے ہی مختلف ہوں لیکن بہر حال کوئی مشترکہ ضابطہ ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر چارہ نہیں کہ اس میدان میں بعض قواعد و ضوابط کی طرح ڈالی جائے، طریقۂ کار کو واضح کیا جائے اس مقصد کے حصول کے لئے ان مسائل میں بات چیت اور ڈائیلاگس کا سلسلہ جاری رہنا

چاہیے' ایسا کرلے سے ایک طرف افکار نکھر کر سامنے آئیں گے تو دوسری طرف خیالات و تصورات میں یکسانیت پیدا ہوگی اور مبادی و مقاصد کے سلسلے میں ایک نقطۂ نظر سامنے آئے گا۔

زیر بحث قضیہ کی جملہ وسعتوں کے ذمہ داروں کے ذہنوں میں واضح ہونے بیشتر اسے دوسروں کے سامنے پیش کرنے اور اس کی افادیت کے بارے میں دوسروں کو مطمئن کرنے میں جلد بازی سے بہرحال اجتناب کرنا چاہیے' ہاں اس کے جواز کی گنجائش صرف اس صورت میں نکل سکتی ہے کہ مسئلہ کو واضح کرنے اور اس کی متوقع و مطلوبہ صورت تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے مسئلہ کو چھیڑا جاتے، یہ اندیشہ تو بہرحال باقی رہے گا کہ بعض ذمہ داروں کے اپنی رائے پر اصرار' اپنی ہی رائے کو عملی جامہ پہنانے کی کاوش' دوسروں کے نقطۂ نظر برداشت کرنے کی عدم صلاحیت بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دوسروں کے نقطۂ نظر کو ناقص' سادہ لوحی پر مبنی اور لچر قرار دینے کے رویہ سے ٹکراؤ پیدا ہوسکتا ہے یہ صورت حال بالخصوص اس وقت پیش آسکتی ہے جب دوسروں کے بارے میں نامناسب اور نازیبا لب و لہجہ اختیار کیا جائے، حالانکہ جو فکری قضایا کے کاموں میں مشغول ہیں اور فکری مسئلوں میں رہنمائی و قیادت کا کردار انجام دے رہے ہوں ان کے لئے ایسی فروز باتیں زیب نہیں دیتی ہیں۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کسی بھی انسانی اجتہاد کے بارے میں آغاز ہی میں معصومیت کا دعویٰ نہ کیا جائے اور اس پر تقدس کا خول نہ چڑھا دیا جائے' اس سے تنقید کی گنجائش نکلے گی اور تنقید کی روشنی میں اصلاح کا دروازہ کھلے گا۔ خوف اور فکری دہشت گردی کی رکاوٹ دور کی جاسکے گی اور دامنِ تفکیر کو پارہ پارہ کر دینے والے الزامات سے بچاؤ اور کنارہ کشی ممکن ہوسکے گی' اسی طرح ہم پر یہ بھی واجب ہے کہ ہمیشہ ہم اپنے آپ کو یاد دلاتے رہیں کہ قضیے کے بنیادی اصول یہ ہیں۔

① فکر، ثقافت، آگہی اور تمدن کا سرچشمہ اپنے اجتہادات کو قرار دینے کے بجائے وحی الٰہی (کتاب و سنت) اور انسان کے کائناتی وجود کو قرار دیں۔

② فکر اسلامی کا جو عظیم سرمایہ ہمارے پاس ہے اس کے بارے میں ہمارا زاویۂ نگاہ یہ ہو کہ وہ ایک مخصوص دور کے انسانی اجتہاد کا نتیجہ اور ثمرہ ہے جس میں خطاء و صواب

دونوں کا احتمال ہے ، معاشرتی اور انسانی علوم کے شعبوں میں جو موجودہ انسانی ذخیرہ جمع ہو چکا ہے ان پر ناقدانہ نظر ڈالیں، مثبت و منفی، طیب و خبیث پاکیزہ و نجس، نفع رساں اور ضرر رساں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کریں ان میں کون سی چیز اسلامی تصور سے ہم آہنگ ہے اور کون سی اسلامی تصور سے متضاد ہے اس کی تعیین کریں، مثبت و نافع کو لے لیں جس کے اندر ابہام و غموض ہو اس کی وضاحت کریں جس میں کمی ہے اس کی کجی دور کریں فن (آرٹ) اور تہذیب کے میدان میں یہی ہمارا طرۂ امتیاز ہو اور اسی کے زیر اثرات کی ذہنیت اور اس کی نفسیات کی تشکیل ہو جو اسلام کی مطلوبہ شکل ہے اور جس کی بدولت عمرانیات کو فروغ ملے گا۔ اور ترقی کا کارواں رواں دواں ہو گا۔

(۴) امت کی زندگی میں جن چیزوں کو ترجیحات کا درجہ حاصل ہے ان کی تدریجی ترتیب کو فراموش کرنے، امت کے مسائل و افکار سے الگ تھلگ ہوتے، خالص ذہنی فکر میں انہماک کی سنگینی اور نزاکت کو محسوس کرنے اور ذہنوں میں تازہ رکھنے جن کے نتیجے میں آدمی حالاتِ حاضرہ سے بالکل کٹ کر رہ جائے اور اُمت کے جسم اور اس کی روح سے کنارہ کش ہو جائے اس لئے علمی، عملی اور اجتماعی فکر کی اہمیت ہمیشہ ذہن میں تازہ رہنی چاہیئے جو ہر قسم کی مشکلات کا فکری علاج پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، فکر کو عمل کے قالب میں ڈھالنے کا وسیلہ بننے کی اہلیت رکھتی ہو، ہمیں امت کو اس کا عادی بنانا چاہیئے کہ وہ افکار کو اعمال کے قالب میں ڈھال سکے۔ اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی طبیعت کی چاہت، نفس کے وسوسے اور ذاتی میلان ہی کو فکر اور فکری تخلیق نہ قرار دیدیا جائے، کیونکہ ذاتی رجحانات، شخصی میلانات اور نفسانی خواہشات ایسے امور ہیں جنھیں ایک حال پر قرار نہیں ہوتا، اس کے مقابلہ میں فکر ہوں جو منطقی، علمی اور عقلی طور پر چند مقدمات کی ترتیب کا نام ہے جس سے صحیح نتائج برآمد ہوں اس کا تعلق بحث و تحقیق تلاش و جستجو اور استقراء سے ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ مقدمات مفکر کو ایسے نتائج تک پہنچا دیتے ہیں جو اس کے رجحانات

اور میلانات کے یکسر مخالف ہوتے ہیں لیکن کوئی مفکر اپنے رجحانات کی بنا پر حاصل شدہ نتائج میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا ہے۔

اس نقطہ کے اختتام پر جس میں ہم نے اہم فکری و منہجی رکاوٹوں اور دشواریوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جن سے آج مناہج فکر کی اصلاح اور علم وآگہی کو اسلامیانے کا قضیہ دوچار ہے ہم چاہتے ہیں کہ پوری قوت کے ساتھ یہ بات کہیں کہ ہوسکتا ہے کہ ان دشواریوں کا شعور ان دشواریوں کو امکانات میں بدلنے کے کام میں معاون ثابت ہو، ان دشواریوں کو اگر صحیح طور سے سمجھا جائے اور ان کے ساتھ صحیح رویہ اپنایا جائے تو ان دشواریوں سے مفید نتائج برآمد کئے جاسکتے ہیں اور اسلامی زاویہ نگاہ سے مدد لے کر زیر بحث قضیہ اور مذکورہ دشواریوں کے موضوع پر بحث و مباحثہ کے لئے قواعد وضوابط مرتب کئے جاسکتے ہیں۔

ان دشواریوں میں یہ قوت بہرحال نہیں ہے کہ ہمارے عمل کو رائیگاں کردیں یا فکری پیش رفت کو روک دیں، ان رکاوٹوں کو دور کرنے ان کا حل تجویز کرنے اور ان کو امکانات میں تبدیل کرنے کے لئے اولین کام یہ ہے کہ پہلے ان دشواریوں سے صحیح واقفیت ہو، دشواریوں کی جانکاری کے بعد ہی حسن کارکردگی کے ذریعہ ثمرآور بنانا ممکن ہوگا۔ صحیح طریقہ بھی یہی ہے کہ پہلے ان دشواریوں اور مشکلات کے عناصر ترکیبی کا صحیح علمی تجزیہ کیا جائے پھر فکری عمل کے واسطے اسے تجرباتی میدان بنایا جائے، اس سے انسانی عمل مالامال ہوگا۔ بلند ہوتے ہوتے مطلوبہ معیار تک جا پہنچے گا اور امت کے مسائل ومشکلات میں فکر کی شمولیت کو آسان کردے گا۔

اس کام کا ہم سے ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ تسلسل اور گہرائی کے ساتھ غور وفکر کیا جائے، کہ بدل بننے والی چیزوں اور متبادل میدان میں کون سے امور ہیں جو ترجیحات کے زمرے میں آتے ہیں یعنی ترتیب میں کس کو مقدم کیا جائے اور کس کو موخر کیا جائے؟ غور وفکر اور ترجیحات کی فہرست مرتب کرنے کا کام منصوبہ بندی کے تحت ہونا چاہیئے ایسی منصوبہ بندی جس میں ایک طرف زمانی و مکانی وسعتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو تو دوسری طرف مثبت امور کا خیال رکھا گیا ہو تو تیسری جانب مسلمان (جو میدانِ عمل ہے) کی صلاحیتوں کا اعتبار کیا گیا ہو مسلمان چاہے جس حیثیت

یں ہو عالم ہو، محقق ہو، عوام ہو، تحریک ہو یا فکری دھارا ہر صورت میں اس کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوگا جب زیر بحث قضیہ کے داعی اور اس کے قائدین وسعت نظر، لچک اور تمام گوشوں کا احاطہ کر لینے والے ذہن کے حامل ہوں، اسی کے ساتھ تخلیقی صلاحیتوں سے بھی مالامال ہوں۔ تخلیقی کاموں کے دو الگ میدان ہیں پہلا میدان تو یہ ہے کہ اپنی تحریری شرکت کے ذریعے زیر بحث قضیہ کی بنیادیں فراہم کریں، مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کریں، دوسرا میدان یہ ہے کہ اس قضیے کے لئے کام کرنے والوں کی صفوں میں نکمّے، کام چور اور پست ہمت لوگوں کو نہ گھسنے دیں کیونکہ یہ میدان بھرپور محنت اور انتھک جدوجہد کا طالب ہے۔ سُست اور کاہل لوگ محنت وجفاکشی کے معیار پر پورا نہیں اتریں گے اور دوسروں کے لئے پست ہمتی کا سبب بنیں گے۔

اخیر میں، ہم آپ تمام لوگوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ سفر کی مشقتیں جھیل کر آپ یہاں تشریف لائے، سیمنار میں شرکت فرمائی، اپنے تجربات، اپنی رایوں اور اپنے مباحثوں کے ذریعہ سیمنار کی افادیت میں اضافہ کے باعث بنے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنے پسندیدہ کاموں کی توفیق ارزانی فرمائے اور ہماری کاوشوں کو اپنی خوشنودی کا ذریعہ بنائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ٔ

خاتمہ

معہد کے ذمہ داروں اور اس کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس میں پیش کرنے کے تقریباً ڈھائی سال بعد اس کتابچہ کی اشاعت ہو رہی ہے، اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ کتابچہ میں پیش کردہ مسائل و افکار میں تمام فرزندانِ اسلام شریک ہوں، خود ان مسائل و افکار کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ ذہن مسلم کی تعمیر، فکرِ اسلامی کی اصلاح اور حالاتِ حاضرہ کے مطابق اسلام کے تہذیبی نظام کی تشکیل کے لئے مسلمانوں کیلئے فکری مناہج کی اصلاح کی جائے، اسلام کے معاشرتی اور انسانی علوم کو سامنے لایا جائے، اس وقفہ میں بڑے بڑے حوادث اور واقعات رونما ہوئے جن کے اثرات عالمی سطح پر بھی پڑے اور اسلامی سطح پر بھی ان واقعات اور ان کے نتیجے میں مرتب ہونے والے اثرات نے ثابت کر دیا کہ بحیثیت عمومی بنی نوع انسان اسلام کا ضرورت مند ہے ان واقعات نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ جملہ مشکلات کا حل صرف اسلام کے پاس ہے۔ دنیا کی توقعات اسلام ہی سے وابستہ ہیں۔ کشتیٔ نجات ہے تو وہی ہے علاج کامل ہے تو وہی ہے۔

لیکن انسانیت کو اسلام کی راہ ملے تو کیسے؟ اس کی جانب رہنمائی ہو تو کیسے؟ اسلام قبول کرنے کی ترغیب کیسے دی جائے؟ ان سوالوں کا جواب صرف اور صرف فکرِ اسلامی ہے یعنی اصولی فکرِ اسلامی کے ذریعہ دعوتِ اسلام کی خدمت انجام دی جاسکتی ہے۔ ایسی فکرِ اسلامی جو ہر قسم کی آمیزش سے پاک صاف ہو، اسلامی خطاب کو ایک نئے قالب میں ڈھالنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو، جو با مقصد ہو، راہ یاب ہو، جس میں تنوع اور اختلاف انسانی کا پورا احاطہ کیا گیا ہو اور یہ سارا کام توحید کے زیر سایہ عمل میں آیا ہو، ایسا اسلامی خطاب جو ایک طرف پوری انسانی برادری کیلئے عام ہو تو دوسری طرف موجودہ تمدن اور اس کی فکری بنیادوں کی کشمکش کے نتیجے میں پیدا

ہونے والی رکاوٹوں کو عبور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، ایسا خطاب جو بلا استثناء ہر انسانی ذہن کو چھو سکے اور ہر دل پر اثر انداز ہو سکے، جو ایسا ہتھر کی صورت اختیار کر سکے جس کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی، ایسا موثر اور دل پذیر خطاب جو دنیا کے سامنے ثابت کر سکے کہ اسلام تمام سابقہ نبوتوں کا وارث اور جانشین ہے، جو جملہ تمدنوں اور تمام تہذیبوں پر حاوی ہے اور ان کی اصلاح کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، جو انسان کے تکوینی حالات کے عین مطابق اور انسانیت کی ہر ندا پر لبیک کہنے والا ہے۔ بس تنہا یہی وہ خطاب ہے جو سچائی کے ساتھ پوری انسانی برادری کو مخاطب بناتا ہے جس کا رُخ انسان کی تخلیقی نسبت کی جانب ہوتا ہے جو جملہ شناختوں اور امتیازات سے کنارہ کش ہے، جہاں نہ شمال ہے نہ جنوب، نہ عالم اول ہے نہ عالم ثانی ہے اور نہ عالم ثالث ہے جہاں شناخت قبیلہ کی بنیاد پر ہوتی ہے نہ قوم کی بنیاد پر اور نہ ہی پارٹی کی بنیاد پر، وہاں شناخت کی بنیاد یہ ہے کہ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی۔ یہ ایسا خطاب ہے جو پوری انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی اس فطرت سے مربوط کرتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اسی طرح قواعد وضوابط اور اصول ومبادی کے ایسے مجموعے سے جوڑ دیا ہے جن کے بارے میں لوگ اپنی فطرت سلیم پر باقی رہتے ہوئے اختلاف نہیں کرتے، ہاں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان قواعد وضوابط کی پابندی کی راہیں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ جب بھی اسلام کے ساتھ ہر قسم کی آمیزش سے پاک اصولی فکر اور روشن ذہن ہم آہنگ ہوتے ہیں تو اسلام اپنا نجات دہندہ خطاب پیش کرنے میں بھرپور صلاحیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

مقصد کی وضاحت اور وسائل کی نشاندہی کرنے میں کتابچہ کے اندر پوری کوشش صرف کی گئی ہے۔ اس ضمن میں پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے تاکہ کتابچہ پڑھنے کے بعد قاری محسوس کرے کہ وہ اس قضیہ کے حاملین کے درمیان زندگی گذار رہا ہے۔ نفس کی خلش، دلوں کی دھڑکن، طرز فکر، آرزوں وتمناؤں اور افکار وخیالات غرض کسی چیز میں مسئلہ کے داعیوں اور کارکنوں سے الگ نہ ہوں۔

ہم اپنے بارے میں یا اپنے مسئلہ کے بارے میں کوئی بات راز میں رکھنا چاہتے ہیں اور نہ کچھ چھپانا چاہتے ہیں، جو کچھ ہے سب واشگاف انداز میں بیان کر دی ہیں تاکہ لوگ جان لیں کہ

ہم نے صداقت کی راہ اپنائی ہے اور ... ت قضیہ میں لوگ شاہد بن جائیں، اس کے بعد جو ہماری دعوت قبول کرتا ہے وہ دلائل کی روشنی میں قبول کرے اور جو اعراض و روگردانی کی روش اپناتا ہے وہ بھی دلیل کی روشنی میں ایسا کرے، مدد و تعاون کرنے والا دلیل کی بنیاد پر کرے اور ساتھ چھوڑ دینے والا بھی دلیل ہی کی روشنی میں فیصلہ کرے۔

"واللہ ھو مولانا وناصرنا انہ نعم المولی ونعم النصیر"

"اللہ ہی ہمارا کارساز اور مددگار ہے وہ بہترین کارساز اور بہترین مددگار ہے"

تعارف مصنف

- نام: ڈاکٹر طٰہٰ جابر علوانی۔
- ولادت: ملک عراق میں ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔
- ابتدائی اور ثانوی تعلیم عراق میں حاصل کی، پھر ازہر یونیورسٹی کے شعبۂ شریعت وقانون سے
- ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹۵۹ء میں بی، اے کی ڈگری حاصل کی۔
- ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۸ء میں ازہر یونیورسٹی کے شعبۂ شریعت وقانون سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔
- ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۳ء میں ازہر یونیورسٹی سے اصول فقہ میں ڈاکٹریٹ مکمل کی۔
- جامعۃ الامام محمدؒ بن سعود الاسلامیۃ ریاض میں ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء سے ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء تک فقہ واصول فقہ کے استاذ رہے۔
- ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء میں ولایت متحدہ امریکہ میں المعہد العالمی للفکر الاسلامی کے قیام میں شرکت کی۔
- آپ معہد کے موجودہ صدر اور ٹرسٹی بورڈ کے ممبر ہیں۔
- رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ کے تاسیسی ممبر ہیں۔
- انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدّہ کے ممبر ہیں۔
- اسلامک فقہ اکیڈمی شمالی امریکہ کے صدر رہیں۔
- امام فخرالدین رازی کی کتاب "المحصول فی علم اصول الفقہ" کی چھ جلدوں میں تحقیق کی ہے۔
- فقہ اور اصول فقہ کے موضوع پر آپ کی م
  - اسلام میں اجتہاد اور ت
  - اسلام میں آداب اخت
  - اصول فقہ اسلامی